میں آواں گی ہوا بن کے

مصنفہ
زاہدہ پروین



اور جب کسی موضوع پر قلم اٹھ جاتا ہے تو پھر اردگرد کا بھی کچھ ہوش نہیں رہتا۔ سو آج کل بھی ایک نئی تخلیق کے مراحل طے کرتے ہوئے قارئین کی پسند ناپسند کو مدِنظر رکھنا پڑ رہا ہے۔ مصروفیت کے باوجود یہ پیش لفظ لکھ تو دیا ہے مگر آپ کی آرا کا انتظار رہے گا۔

اپنا لکھنا لکھانا تو سرشت میں سرائت کر چکا ہے جس سے پیچھا چھڑانا نا ممکن ہے۔

انگلیوں کو تراش دوں پھر بھی
عادتاً اس کا نام لکھیں گی
کھڑکیوں پہ دبیز پردے ہوں
بارشیں پھر دستک دیں گی

زاہدہ پروین۔

ہُو بے باریاں تے نال کنداں ٹپ کے
آواں گی ھوا بن کے
ہُو بے باریاں تے نال کنداں ٹپ کے

گانے کے اتنے خوب صورت بول ہوں' آواز سے سوز و گداز شہد بن بن کے ٹپک رہا ہو اور ہر آن بڑھتی شام کے سائے ہوں تو پھر بھلا کس کافر کا جی نہ چاہے گا کہ ہمہ تن گوش ہو کر سنتا ہی رہے بس یہی حال اس وقت رانی کا بھی تھا۔

مگر ساتھ ہی اُسے زبردست کوفت کا احساس بھی ہو رہا تھا کیوں کہ شہر کی طرف عازمِ سفر جس بس میں اس وقت یہ گیت ہمہ تن گوش کیفیت میں سن رہی تھی' مناسب رفتار سے چلنے کے باوجود انجن کے شور اور کھٹیر پٹیر نے سارا مزہ کرکرا کر رکھا تھا اور وہ کئی مرتبہ پہلو بدل بدل کر اس شور کو کوس چکی تھی۔

تبھی 'اَنہونی' ہونی میں تبدیل ہو گئی اور بس ایک زوردار دھماکے کے ساتھ لنگڑاتی ہوئی اچانک تھم گئی۔ رانی قدرت کی فیاضی پر عش عش کر اٹھی۔ اگر اس وقت خدا سے کچھ اور بھی مانگتی تو شاید مل جاتا!

اب صورتِ حال یہ تھی کہ بس کا پچھلا ٹائر پنکچر ہو چکا تھا اور وہ مزے سے ٹانگ

پرٹانگ رکھ کرآنکھیں موندے گیت کا اگلا حصہ سن رہی تھی۔

واں دیاں راہاں تے پیر نے نجیوں لگدے
مقدراں دے لکھے ہوئے مٹ نجیوں سکدے
میتو رب نے بنایا تیرے لئی اوئے
متھے تیرا ناں لکھ کے
ٹو بے باریاں تے نال کنداں ٹپ کے
میں آواں گی ھواہن کے ...
ٹو بے باریاں.....

آواز کے حُسن اور شاعری کے سحر نے رانی کو مست و بے خود کر دیا۔ اچھی موسیقی اُس کی یوں بھی کمزوری تھی اور اِن لمحات میں وہ اس لیے بھی خالی الذہن سی ہو رہی تھی کہ تمام دن پڑھانے اور ڈیوٹی دینے کے بعد مختصر سے سفر کے یہ لمحات اُسے روز ہی بہت اچھے لگا کرتے تھے۔ اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا اور پرسکون سا محسوس ہوتا اس لیے وہ بس پر پڑنے والی اُفتاد سے بے خبر بڑی توجہ اور یکسوئی سے سُن رہی تھی۔ بس میں فُٹ کیسٹ پلیئر برابر آن تھا۔

تھن جدوں چڑھیا تے لوکی پئے تکدے
ڈو نگے پانڑیاں دے وچ دیوے پئے بلدے
کندے لگ جاواں' کچا گھڑا ہن کے'
میں آواں گی ھواہن کے
ٹو بے باریاں تے۔

لیکن اس کے پسندیدہ لمحات زیادہ دیر پا ثابت نہ ہو سکے اور اس سے قبل کہ وہ حرفِ لطف اندوز ہو سکتی' کسی نے اُسے شانے سے پکڑ کر ہلا دیا۔

اُس نے سیدھی ہو کر دیکھا۔

برابر والی بوڑھی عورت گھبرا گھبرا کر کہہ رہی تھی۔ "سنا تو نے لڑکی! بس کا پہیہ پھٹ گیا ہے۔"

"تو کیا ہو گیا! دوسرا لگ جائے گا۔" رانی نے ناگواری سے جواب دیا۔

"مصیبت تو یہی ہے کہ ان کے پاس پہیہ ہے ہی نہیں۔"

اب رانی کے لیے اِس مداخلتِ بے جا کو برداشت کرنا ممکن نہ رہا۔ بہت بے زاری اور بدتمیزی سے بولی۔ "وہ کسی دوسری بس سے لے سکتے ہیں۔ تم میرے کان مت کھاؤ۔"

مگر بڑی بی بھی نہایت ڈھیٹ واقع ہوئی تھیں' کڑک کر بولیں۔ "اے تو تیری آنکھیں کیا پھوٹی ہوئی ہیں! دیکھ نہیں رہی دو بسیں رُکے بغیر کچے پر اُتر کے جا چکی ہیں۔ کسی نے بھی پہیہ نہیں دیا۔ ڈلیور (ڈرائیور) بے چارا چلاتا رہ گیا۔ لو جی بھلائی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ میں تو کہہ رہی تھی یوں ہی شام پڑ جائے گی۔ کہاں جائے گی اکیلی پر یہ تو اپنے آگے کسی کو جانے ہی ناں' واوجی خوب رہی۔" وہ خوب بڑبڑاتی اپنی گٹھڑیاں لے کر نیچے اُتر گئی۔

اب رانی کے بھی ہوش ٹھکانے آئے۔ بڑی بی کی بڑبڑاہٹ' کیا رات پڑے اس جنگل بیابان میں بس والوں کے ساتھ رہے گی؟" اس کا دل دھک دھک جیر گئی تھی۔

اردگرد کے ماحول پر غور کیا تو اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔ چند ایک زنانہ سواریوں کے علاوہ سب بس سے اُتر کر اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ عملے کے لوگ پریشانی کے عالم میں لوگوں کو تسلیاں دیتے پھر رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف کھیتوں کا سلسلہ دُور تک پھیلا تھا۔ جگہ جگہ ریت کے اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ چنے اور سرسوں کے کھیتوں میں شام کی ہوا سرسراہٹیں پیدا کر رہی تھی۔ تیار کھڑی فصلوں کے پودے بھی لہلہا رہے

تھے جن کے بیچ کچی پگڈنڈی پر دو ساتھ قی سوار گرد کے بگولے اُڑاتے چلے جا رہے تھے۔ سرسوں کے جھکے ہوئے پیلے پیلے پھولوں پر شام کا سرمئی آنچل پھیلتا لہراتا' کرتا چلا آ رہا تھا۔

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے لمبی لمبی چنریوں اور گھاگھرے والی عورتوں نے روتے بسورتے بچوں کو گودوں میں بھرا' مردوں نے میلی کچیلی گٹھڑیاں شانوں پر ڈالیں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے پیدل ہی سڑک پر ہو لیے۔ رانی کے ساتھ جھڑپ لینے والی بڑی بی بھی ان کی ہم سفر تھیں۔ اُس نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی' وقت کا اندازہ ہوتے ہی اُسے شدید بھوک کا احساس ہوا' ساتھ ہی اماں بی کا بے قرار وجود اور شرمین کی منتظر نگاہیں بھی ہولانے لگیں۔ آج ویسے ہی کالج میں تین بج گئے تھے اور اُس کی ہر روز والی بس چھوٹ گئی تھی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اماں بی کی زیادہ فکر تھی کیونکہ وہ اختلاجِ قلب کی مریضہ تھیں۔ شرمین بھی اب تک اُس کے انتظار میں بھوکی بیٹھی ہو گی۔ یہ خیال ہی روح فرسا تھا۔ جاتی گرمیوں اور آتی سردیوں کی یہ ہر دم ڈھلتی شام اس کے لیے عذاب ہو گئی۔ اُس نے کھڑکی کا شیشہ ہٹا کر کنڈیکٹر کو بلایا اور غصہ اسی پر اُتار ڈالا۔

''کیا بات ہے؟ بس کیوں روک رکھی ہے؟'' اُس نے انجان بن کر پوچھا۔

''آپ دیکھ نہیں رہیں! پچھلا ٹائر پنکچر ہو چکا ہے۔'' کنڈیکٹر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''تو...... کیا آپ کے ملنگ کو ٹائر بدلنا نہیں آتا!'' اُس نے اپنا انداز بدلا۔

''جی نہیں بلکہ اتفاقاً دوسرا ٹائر نہیں ہے ہمارے پاس۔'' کنڈیکٹر نے پھر اسی بے نیازانہ انداز میں جواب دیا۔

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

اب وہ بھڑک کر بولی۔ ''واہ جی! اس ''اتفاق'' کی بھی خوب رہی۔ لاکھوں کی بس تو خرید سکتے ہیں مگر فالتو ٹائر نہیں رکھ سکتے' آپ لوگوں کو مسافروں کی سہولت کا ذرہ برابر خیال نہیں......''

''جی...... اب ہم کیا کر سکتے ہیں! بس اللہ کی مرضی۔'' کنڈیکٹر پوری ڈھٹائی سے اپنا دفاع کیے جا رہا تھا۔

''اچھی بات ہے۔'' وہ ٹھنڈے لہجے میں بولی۔ ''اب آپ ایسا کریں کہ پسنجروں کا کرایہ واپس کر دیں شرافت سے۔''

اِدھر اُدھر ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے مسافر یہ تکرار اور بحث سن کر کنڈیکٹر کے ارد گرد جمع ہونے لگے تھے۔ اس کا تو دم نکل گیا۔ ساری اکڑفوں بھول کر ہکلاتا ہوا بولا۔ ''یہ...... کیا کہہ رہی ہیں آپ...... کمال کرتی ہیں آپ تو...... صرف تو میل تو شہر رہ گیا ہے یہاں سے......''

''واہ واہ...... آپ تو کسی ٹوٹے مرے فقیر کو بھی ایک روپیہ نہیں چھوڑتے۔'' وہ مزید چمک کر بولی۔ ''اور اب تو میل کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔'' پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر بڑی دھونس سے بولی۔ ''براہِ کرم آپ ان سب کا کرایہ واپس کریں...... اگر آپ لوگوں سے متبادل سواری کا انتظام نہیں ہو سکتا۔''

پسنجروں کو تو فوراً سے پیشتر ہی یہ مشورہ پسند آ گیا۔ چاروں طرف سے ہانکیں لگنے لگیں۔ بھلا ایسی نیکی کون رد کر سکتا ہے! جلد ہی بس کے عملے نے اکثریت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور پسنجروں سے اپنا حساب کتاب چکا کر جان چھڑائی۔

جھلاہٹ ہی جھلاہٹ میں یہ تمام کارروائی تو رانی نے کر ڈالی تھی مگر اصل مسئلہ جوں کا توں موجود رہا۔ چور کو چور کے گھر پہنچا دینا اس کی عادت میں شامل تھا اس سلسلے میں بعض اوقات خود اپنا نقصان بھی کر بیٹھی تھی۔ چنانچہ اس وقت بھی کنڈیکٹر سے

جھڑپ لینے کے بعد وہ پہلے کی نسبت زیادہ غیر محفوظ ہو گئی۔ بس کا علاقہ کہا جانے والی نظروں سے محروم رہا تھا۔ صوبے کا اندرونی علاقہ ہونے کی وجہ سے ان اطراف میں کسی رکشہ ٹیکسی کے ملنے کا امکان ہی نہ تھا۔ بس کے مسافر بھی زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ اور دیہاتی قسم کے تھے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے شہر جانے والے ایک ٹرک کو روک کر کچھ لوگ اس میں بھر کے چلے گئے اور بس کے عملے کے علاوہ چند افراد ہی باقی رہ گئے یا پھر یک و تنہا وہ خود تھی۔

اور اب بس کی سیٹ پر کہاں تک بھی رہتی طوعاً و کرہاً نیچے اتر آئی اور دل مضبوط کر کے حالات کا جائزہ لینے لگی۔

شام کا جھٹپٹا ہر طرف پھیل گیا تھا۔

سڑک کی دوسری طرف جنگلی جھاڑیاں اور اونچی اونچی گھاس تھی۔ پرندوں کے جھرمٹ بھر امبار کے جھاڑیوں سے نکلے اور نہ معلوم سمتوں کو اڑ جاتے۔ کووں کے غول غول کائیں کائیں کرتے شور مچاتے اپنے بسیروں کی طرف محو پرواز تھے۔ رانی کے آس پاس چند کھانستے کھنکارتے مردوں کے علاوہ کوئی ذی روح نظر نہ آتا تھا۔ شہر یہاں سے بہت دور تھا۔ پوری قوت سے بھی بھاگتی تو بھی نہ پہنچ پاتی۔ اس نے دوپٹہ قاعدے سے شانوں پر پھیلایا۔ چشمہ اتار کر پرس میں رکھا اور قدم جما جما کر رکھتی ہوئی سرس کے درختوں کے اس جھنڈ کی طرف چل دی جن میں پیلے پیلے پھولوں کے گچھے جھول رہے تھے۔ ان کی دل نواز مہک ہوا میں رچی ہوئی تھی۔ دور کیڑے کیکروں کے پیچھے دھواں اٹھ رہا تھا اور دھند لکے میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا جو اس امر کی علامت تھا کہ ضرور ریت کے بکھرے ہوئے ٹیلوں اور ٹیوں میں کہیں نہ کہیں انسانی آبادی موجود ہے۔ مگر رانی کو ان سے کیا مدد مل سکتی تھی! وہ تو درختوں کے نیچے اس امید میں آ کھڑی ہوئی تھی کہ کسی سے لفٹ مانگ سکے۔ دوسروں کی چمچماتی گاڑیوں پر

کرائے کی بسوں کو ترجیح دینے والی کے لیے یہ قطعی پہلا چانس تھا جب کہ دل ہی دل میں وہ اس صورت حال سے سخت ہراساں اور خوف زدہ تھی اور شاید یہ اسی بدحواسی کا نتیجہ تھا کہ اس نے لفٹ کے لیے ہاتھ بھی دیا تو مخالف سمت سے آنے والی گاڑی کو۔

"فرمایئے؟" لمبی سی خوب صورت گاڑی کے اسٹیئرنگ کو تھامے ایک بے حد رعب دار اور باوقار شخصیت نے سر باہر نکال کر بڑی شائستگی سے دریافت کیا۔

وہ جھجک کر نزدیک پہنچی اور جلدی جلدی تیز لہجے میں اپنی بپتا سنانے لگی۔

"دیکھیے پلیز! بالکل شام ہو گئی ہے..... بس کا ایک ٹائر پنکچر ہو گیا ہے دو گھنٹے ہو گئے دوسری سواری بھی نہیں مل رہی..... بہت ڈ..... ڈر لگ....." رانی نے کپکپاتے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

"او..... آئی سی....."

انہوں نے ڈوبتی شام میں بے کار کھڑی بس اور پھر رانی کے ہلکے پھلکے وجود کو بغور تشویش نظروں سے دیکھا۔ پھر پلٹ کر کار کی پچھلی سیٹ کو دیکھنے لگے۔

ان کا تذبذب جلد ہی رانی کی سمجھ میں آ گیا۔

پچھلی سیٹ پر بہت سے سامان سے بھرے ہوئے پیکٹ بے ترتیب حالت میں بکھرے ہوئے تھے۔ غالباً رکھنے والے نے اکیلا ہونے کی وجہ سے یا پھر لاپروائی سے گاڑی کی ڈکی استعمال ہی نہ کی تھی۔

رانی کو اس صورت حال پر کیا اعتراض ہوتا تھا! جنگل میں کھڑے رہنے سے تو یہ کہیں غنیمت تھا۔ وہ تقریباً بھاگتے قدموں سے گھوم کر دوسری طرف آئی اور عجلت میں فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی۔ مبادا وہ چھوڑ نہ جائیں!

صاحب کار نے ایک گہری سانس لے کر گاڑی اسٹارٹ کی ایک چھوٹا سا موڑ کاٹ کر اس کا رخ دوبارہ شہر کی طرف کر دیا۔ گاڑی کا رخ تبدیل ہوتے ہی رانی کو

اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا وہ گنگ سی ہو گئی۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ جھجکتے ہوئے بولی۔

"مجھے بہت زیادہ افسوس ہے جناب ...... کہ میری وجہ سے آپ کو بہت زحمت ہو رہی ہے۔ آپ یقین کیجیے ......!"

"او کیپ سائیلنٹ پلیز ......" انہوں نے ایک ہاتھ کی انگلی اٹھا کر اُسے خاموش کرا دیا۔ "مجھے رسمی تکلفات سے بہت کوفت ہوتی ہے۔ آپ پریشان تھیں میں نے بروقت آپ کا مسئلہ حل کر دیا۔ بس بات ختم۔ ڈائریکٹ اپنے گھر پہنچنے کی بجائے آپ کے ہاں جا رہا ہوں۔ یہ امر آپ کے لیے شرمندگی کا باعث ہونا چاہیے؛ میرے لیے زحمت کا۔" انہوں نے بات کچھ اس انداز میں کی کہ رانی چپ کی چپ رہ گئی۔ اس کے پاس بولنے کو رہ بھی کیا گیا تھا مگر انہوں نے شاید ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ لمحہ بھر بعد ہی وہ پھر اپنی گمبھیر آواز میں پوچھ رہے تھے۔

"ویسے بائی دی وے کیا پوچھ سکتا ہوں کہ اتنی شام گئے یہاں شہر سے باہر آپ کا کیا کام وہ بھی تنہا؟" گفتگو کے آغاز میں لہجے کی نرمی اور ملائمت اُسے مسحور کر چکی تھی مگر سوال کا اختتام ہوتے ہوتے انداز تیکھا اور کٹیلا ہو گیا جیسے کوئی بزرگ کسی نادان بچے سے بازپرس کر رہا ہو۔

اچانک رانی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بلاوجہ ہی اُس سے بدگمان ہو چکے ہوں بلا کسی جان پہچان یا دوستی کے۔ ممکن ہے وہ اسے کوئی غلط ٹائپ لڑکی سمجھ بیٹھے ہوں اور اس وقتی طور سے اتفاقیہ صورت حال کو سوچی سمجھی اسکیم یا بہانہ خیال کر رہے ہوں اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان کے ذہن میں سرے سے ان سب خرافات کی گنجائش ہی نہ ہو! مگر اب اس کو کیا کیا جاتا کہ رانی نے یہ تمام باتیں ایک پل میں سوچ ڈالیں اور سوچتے ہی اس کی خودداری بے پناہ جھلاہٹ بن کر دماغ پر ٹھوکریں رسید کرنے لگی اور جب بولی تو اس کا لہجہ بڑا تلخ اور جلا بھنا تھا۔

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

"غالباً میں لفٹ لیتے وقت عرض کر چکی ہوں کہ رکشے والے سے سواری نکل رہی تھی ...... اب اگر آپ اپنی رسٹ واچ پر نظر دوڑائیے تو آپ کو یقیناً اندازہ ہو جائے گا کہ اس وقت سے دو گھنٹے قبل بڑھتی شام کی بجائے ڈھلتی سہ پہر کا سماں تھا ...... ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس ویرانے سے میں تفریحاً نہیں گزر رہی تھی بلکہ کالج سے آ رہی تھی۔"

"اوہ ...... اچھا تو یہ بات ہے" وہ اس کے تند لہجے کو نظر انداز کر کے بڑی آسودگی سے بولے۔ گویا مطمئن ہو گئے ہوں۔

"ٹھیک ...... بالکل ٹھیک ...... اچھا کس ایئر میں پڑھتی ہیں؟"

"جی نہیں ...... بلکہ پڑھاتی ہوں۔" رانی کا موڈ اب تک خراب تھا۔ دفعتاً انہوں نے سامنے سڑک سے ہٹا کر اپنی بے حد مخموری آنکھیں اس پر گاڑ دیں اور تمسخرانہ انداز اور چبھتے لہجے میں بولے۔ "میرا خیال ہے بی بی! آپ کی اور میری عمر میں دگنے کا فرق تو ضرور ہی ہوگا۔ کیا ایسے میں آپ کو مجھ سے غلط بیانی زیب دیتی ہے؟"

رانی کا غصہ نقطۂ عروج پر پہنچ کر خود بخود دھیما پڑ گیا اور وہ جی ہی جی میں بڑی بے چارگی سے سوچنے لگی۔ "یا اللہ لوگ صرف اپنے آپ کو ہی قابل کیوں سمجھتے ہیں! خود پسندی کی انتہا ہے یہ بھی۔ بیکار ان صاحب سے لفٹ لی۔ مغرور ...... بدتمیز ...... خود پسند کہیں کے!! گاڑی نہ ہوئی قیمتی ایروپلین ہو گیا ...... کسی کو خاطر میں نہیں لا رہے۔"

مزید خاموشی انہیں اور زیادہ شبہے میں مبتلا کر سکتی تھی۔ لہٰذا بڑے اعتماد سے سر اٹھا کر بولی۔ "آپ سے جھوٹ بول کر مجھے کون سا انعام و اکرام مل جائے گا اور یہ کوئی ایسی اعزازی سروس ہے جس پر آپ کو غلط بیانی کا گمان گزر رہا ہے!"

ان کے ہونٹوں پر بے ساختہ قسم کا ایک دل نواز سا تبسم چمک اٹھا اور وہ رانی کے چہرے کے تاثرات دیکھے بغیر کہنے لگے۔

"او... آئی ایم سوری مس! آپ میری بات سے غلط اندازہ مت لگائیے در اصل آپ اتنی Young سی ہیں کہ میرے نزدیک تو ابھی ... اسٹوڈنٹ ہی ہوں گی۔"

اب رانی نے ایک طویل سانس کھینچی اور پرس سے چیونگم نکالتے ہوئے لاپرواہی سے بولی: "علم کی دنیا میں تو انسان ساری عمر اسٹوڈنٹ رہتا ہے لیکن جہاں تک میرے اسٹوڈنٹ ہونے کا سوال ہے تو جناب میری عمر کچھ کم بھی نہیں ہے بلکہ میں زیب النساء کالج برائے خواتین میں لیکچرار ہوں اور میری اس سروس کو گیارہ ماہ کا عرصہ..."

بعد کا فقرہ اس کے منہ میں ہی رہ گیا۔ گاڑی چلتے چلتے سڑک پر لہرا گئی تھی۔ رانی کا سر پوری قوت سے ان کے شانے سے ٹکرایا۔ گھڑی بھر کو سب گڈمڈ ہو گیا۔ گاڑی اچھل کر کچے میں اتر گئی اور سامنے سے بھاری بھرکم ٹرک لڑکھڑاتا ہوا ہوا کے جھونکے کی مانند پاس سے گزر گیا۔ حواس بحال ہوئے تو وہ سنبھل کر سیٹ پر بیٹھ رہی۔

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ڈیش بورڈ سے ٹشو اٹھا کر پیشانی پر چمکتی پسینے کی بوندیں جذب کیں۔ خود بخود ہی ہنس کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے شگفتگی سے گویا ہوئے۔ "سوری... ہاتھ ذرا بہک گیا تھا۔ ہاں... تو آپ کیا کہہ رہی تھیں؟ یہ زیب النساء کالج کدھر ہے بھلا؟"

رانی کو ان کے اچانک بدل جانے والے موڈ اور کریدنے کے انداز پر سخت کوفت ہوئی۔ دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

"ہائے یہ بے چارے مردوں کی فطرت بھی کیا خوب ہوتی ہے! چاہے کیسی ہی اعلیٰ فیملی سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں مگر اپنی فطری آنا کانی سے نہیں چوکتے۔ واہ مولا! خوب فرصت میں تخلیق کی تو نے یہ مخلوق بھی۔"

"ہاں تو آپ نے بتایا نہیں؟" انہوں نے ونڈ اسکرین پر نگاہیں جمائے جمائے

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

سرسری انداز سے پوچھا۔

رانی نے چیونگم چباتے چباتے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "یہ ہم گڑھ کا ایک کالج ہے جو نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم کی ذاتی جاگیر کا ایک حصہ ہے اسی حصے میں خاندانی رہائش گاہ "قصر دیدار" بھی واقع ہے۔ انہی کی ہمشیرہ زیب النساء نے یہ کالج قائم کیا ہے بلکہ خود پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔"

"بہت خوب بھئی بہت خوب..." وہ زیرلب مسکرا کر پھر گویا ہوئے۔ "مجھے تو حیرت ہو رہی ہے بھلا اُن کو سروس کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

معاً رانی کو محسوس ہوا ان کا لہجہ مصنوعی سا ہے۔ جانے کیوں اتنا اہم بے حد تحمل اور جیتے لہجے میں بولی۔ "معاف کیجئے گا آپ کے خیالات بچگانہ سے ہیں۔ میرے خیال میں تو سروس ہمیشہ مالی مسائل حل کرنے کا ذریعہ نہیں ہوا کرتی بلکہ اکثر اوقات دیگر انسانی خواہشات کی تکمیل بھی کرتی ہے۔ ہماری پرنسپل صاحبہ کا کہنا ہے کہ وہ بچپن ہی سے درس و تدریس کی شائق رہی ہیں۔ اسی سلسلے میں انہوں نے خطیر اخراجات کے ساتھ یہ کالج قائم کیا ہے اور اس طرح خود اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل بھی کی ہے۔"

"آپ بھی غالباً شوقیہ ہی!" انہوں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"جی نہیں!" اس نے گردن جھٹک کر جواب دیا۔ "میری سروس شوقیہ نہیں بلکہ ایک مجبوری ہے۔"

انہوں نے یقین آ جانے والے انداز میں اپنے خوب صورت بالوں والے سر کو جنبش دی اور کسی انجانی سوچ میں کھو گئے۔

وہ خود بخود بہت سنجیدہ اور چپ چپ سے ہو گئے تھے۔

اب شہری آبادی کے آثار شروع ہو گئے تھے۔

کچھ آگے چل کر رانی نے دائیں طرف سے سیدھے راستے کی طرف اشارہ

کیا۔ اسٹر [illegible] اور مسکراتی شام کے سنگم میں وقت بے حد خوب صورت اور دل نواز ہو رہا تھا۔

"بس جناب! ادھر روک لیجیے!" رانی نے اطمینان کا گہرا سانس لیتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ گاڑی بجری کی سرخ روش سے ہوتی ہوئی آہستگی سے رہائشی عمارت کے گول ستونوں والے خوب صورت برآمدے کے پاس تھم گئی۔ اونچے اونچے یوکلپٹس اور املتاس کے درختوں سے گھرا ہوا یہ جدید طرز کا ایک چھوٹا سا خوش نما بنگلہ تھا جس کا مختصر سا لان موسم بہار کے تازہ پھولوں سے مہک رہا تھا۔ خوش گوار جھونکے مہندی کی مدھر مدھر احساسات کو چھیڑنے والی متوالی خوشبو سے لدے پھندے تھے جس کے تعاقب میں املتاس کے پھولوں کی پتی کو چھو لینے والی مہک بھی لپکی چلی آ رہی تھی۔

رانی کے اترتے ہی شرمین بے تحاشہ بھاگتی ہوئی اُس سے آ لپٹی۔

"اللہ آپا! آج تو آپ نے مار ہی ڈالا اتنی دیر۔"

رانی نے پیار سے اُس کی پیشانی چوم لی۔ پھر گاڑی کے اندر جھانک کر شوخی سے بولی۔ "آپ رکی باتوں سے الرجک ہیں اس لیے یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آیئے ایک کپ چائے پی کر جایئے مگر میری اتنی درخواست ضرور ہے کہ پلیز! اپنے پانچ منٹ مزید ضائع کیجیے اور چل کر میری اماں بی کو تسلی دیجیے کہ آپ نے بروقت میری ہیلپ کی اور بخیریت پہنچا دیا۔"

خلافِ اُمید وہ ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر دوسرا پٹ کھول کر باہر نکلے اور برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

"کون ہیں یہ؟" شرمین نے اشارے سے دریافت کیا۔

"خاموش رہو!"

رانی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

ان کو اماں بی سے متعارف کروا کے وہ سیدھی کچن میں چلی گئی۔ وہ [illegible] وقت میں بہت کچھ کر لینا چاہ رہی تھی۔

اور جب وہ پرتکلف چائے کے ساتھ ٹرالی دھکیلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچی تو وہ شرمین اور اماں بی سے یوں گھل مل کر باتیں کر رہے تھے جیسے بہت ساری عزیز داریاں نکل آئی ہوں بیک وقت رانی کو مطلق نظر انداز کیے وہ اماں بی کو خوش کر رہے ہے۔ اپنی خوش کلامی، خوش خلقی اور خوش گفتاری سے اور اماں بی! وہ تو ان سے اس قدر خوش اور متاثر ہوئیں کہ وقتِ رخصت انہیں بار بار پھر آنے کی تاکید کرتی جا رہی تھیں۔

رانی کو ان کے رویے پر حیرت تھی۔ اس کو اس طرح سے نظر انداز کیے ہوئے تھے جیسے وہ سرے سے موجود ہی نہ ہو! جب کہ شرمین اور اماں بی کو "اللہ حافظ" کہتے ہوئے ان کی نگاہ بہت بلندی پر یوکلپٹس کے پتوں میں الیکٹرک پول سے لپٹی دودھیا روشنیوں والی ٹیوب سے الجھی اور بغیر دیکھے ہی ان کی نظروں میں کریم کلر کے کرتے شلوار میں لپٹا رانی کا وجود مسحور کن خواب کی مانند جل اٹھا اور وہ سینے میں شور مچاتی بے شمار خوش گوار دھڑکنوں کو چھپائے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگے۔



کالج لائبریری کا وسیع و عریض ہال، یہاں سے وہاں تک خالی پڑا بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ اونچی اونچی شیشے کی شاندار الماریوں میں خوبصورت، مجلد کتابیں ترتیب سے سجی ہوئی ہیں۔ علم کے خزانے لیے کتابیں، نصابی اور غیر نصابی کتابیں۔

دوپہر کے سنانے میں اچانک گھڑیال کی "ٹن ٹن" بھاری بھر کم آواز کی طرح ابھری اور بتدریج معدوم ہوتی چلی گئی۔ پھر طالبات کے تیز تیز قدموں کی آوازیں راہداری میں ادھر ادھر سے آتی گئیں اور پھر وہی جی کو بھلی لگنے والی پیاری سی مدھری خاموشی۔

رانی کا فری پیریڈ تھا۔ اس کا فارغ وقت زیادہ تر کالج لائبریری میں گزرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ایک شیشے کی الماری کے سامنے کھڑی کتابیں الٹ پلٹ رہی تھی۔

اپنے علاوہ اماں بی کے لیے بھی اکثر کوئی نہ کوئی گھریلو ٹائپ کتاب لے جایا کرتی تھی۔

"پرنسپل صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں۔"

رانی اپنی محویت سے ابھری تو چپراسن اسے اطلاع دے کر جا چکی تھی۔ اس نے

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

منتخب کی ہوئی کتابیں وہیں چھوڑیں اور تیز [illegible] کی راہ لی۔

نواب زادی زیب النساء بیگم کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں۔ یہی اس کالج کی بانی اور پرنسپل تھیں۔ ادھیڑ عمر کی بہت باوقار اور حسین خدوخال والی خاتون شخصیت کا رکھ رکھاؤ اور سحر دیکھنے والی نگاہ از خود محسوس کرتی ہے۔ سرخ و سپید چہرے پر سنہری کمانیوں والی عینک شخصیت کی ہمہ گیری میں مزید اضافہ تھا۔

رانی کو سامنے دیکھ کر زیر لب مسکرائیں لیکن منہ سے کچھ کہے بغیر ریسور اس کے ہاتھ میں تھما کر باہر چلی گئیں۔

"ہیلو...... رانی اسپیکنگ!" اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی صاحب زادی افروز جہاں کی چہکتی ہوئی کھنک دار آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"آ خاہ...... آ گئیں مہارانی جی! آج کل کہاں گم ہیں محترمہ؟"

"کیوں...... میری گمشدگی کا اشتہار پڑھ لیا کیا کہیں!" رانی نے کہیں زیادہ شرارت سے پوچھا۔

"اشتہار تو نہیں...... ہاں اک دل چسپ خبر ضرور سنی ہے۔" بڑے معنی خیز انداز میں کہا گیا۔

"کون سی خبر؟ اور کس نے سنائی؟" رانی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"دیکھا! اب کیسا دم نکلا؟"

صاحبزادی کو ہنسی آ گئی ریسور میں بہت ساری نقرئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

"بھئی...... بتاؤ نا؟" رانی جھلا گئی۔

صاحبزادی نے ہنسی ضبط کی اور لہجہ پُر اسرار بنا کر بولی۔ "کون سی خبر ہے؟ جاننا چاہتی ہو تو فوراً چلی آؤ ہمارے پاس۔ رہا سوال ہمیں کس نے سنائی ہے تو تمہیں

اس سے کیا؟ شادی ہوئی کی مہارانی نے اپنے اپنے ذرائع ہوتے ہیں جی!"

"افروز ...... پلیز! پریشان مت کریں، کلاسز شروع ہونے کو ہیں۔ دو بجے سے قبل فارغ نہیں ہو سکتی۔ آپ ابھی بتائیں مجھے۔"

رانی نے مذاق چھوڑ کے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔

"جی نہیں۔ ایسا تو قطعی ممکن نہیں مہارانی جی!" صاحبزادی نے بڑی دھانس سے کہا۔

"آج نہیں تو کل۔ آنا تو بہرصورت تمہی کو پڑے گا۔" اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔

رانی اُلجھ کر رہ گئی۔

پتہ نہیں صاحبزادی افروز جہاں نے کیا کہا تھا؟ اور کیا کہنا چاہ رہی تھی!! حد ہو گئی شوخی کی!!! ضرور کوئی بات ہے۔ اُس کا وہمی دل دھکڑ پکڑ کرنے لگا۔ اِک ذرا ذہن پر زور دیا مگر کچھ سمجھ نہ آئی جانے کو تو وہ ابھی "قصرِ دیواز" چلی جاتی۔ چھٹی مل سکتی تھی اُسے مگر قباحت یہ تھی کہ افروز جہاں اور شاہ جہاں اُسے شام سے پہلے قیامت تک واپسی کی اجازت نہ دیتیں۔ ان کے بے پناہ خلوص کے آگے وہ ہار دیا کرتی تھی۔ ایسی اپنائیت اور اتنی چاہت تو کبھی اُسے ملی ہی نہ تھی۔ دلی طور سے وہ ان کی قدرداں بھی بہت تھی مگر آج تو وہ اماں بی سے کہہ کر بھی نہیں آئی۔ وہ اور شرمین پریشان ہو جاتیں لہٰذا اُس نے آج کا جانا کل پر ملتوی کر دیا۔

یہ نواب فیملی عام نوابوں کی نسبت نہایت ہی عجیب اور حیرت انگیز فیملی تھی۔ انتہا سے زیادہ سادہ، پُر خلوص اور نیک طینت لوگ۔ ظاہری آن بان اور بناوٹی تکلفات سے کوسوں دور۔ حقیقت میں اُن پر آسمان سے زمین پر اتر آنے والے فرشتوں کا گمان ہوتا تھا۔ یہ تمام احساسات ایسا نہ تھا کہ صرف رانی کے ہی تھے بلکہ یہ لوگ سچ مچ

...روایات سے ہٹ کر سلجھے ہوئے بہت مہذب اور اعلیٰ کردار کے لوگوں میں سے تھے۔

جب رانی کا تقرر زیب النساء کالج میں ہوا تو شروع میں پریشانی اور بے پناہ ہول سے اُسے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔

قصے کہانیوں میں پڑھے پڑھائے اور ڈراموں فلموں میں دیکھے ہوئے نوابوں کے عجیب و غریب واقعات اور کہیں لامحدود غرور اور خاندانی تفاخر کے قصوں نے اُسے بہت محتاط اور چوکنا کر دیا تھا۔ یوں بظاہر کسی تشویش یا خدشے کی بات بھی نہ تھی کیوں کہ یہاں اُس کی حیثیت محض ایک گورنمنٹ سرونٹ کی تھی۔ ڈیوٹی کو محض ڈیوٹی کی طرح نبھا سکتی تھی مگر بہرحال وہ تھی تو ایک لڑکی ہی۔ وقت اور حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر گھر کی محفوظ چہار دیواری سے باہر نکلنے والی لڑکی جسے خراب اور ناسازگار ماحول کا ایک ہی زہریلا جھونکا کہیں سے کہیں پہنچا سکتا ہے اسی لیے ان دنوں سنے سنائے نوابی ماحول اور جاگیردارانہ مزاجوں سے اندر ہی اندر وہ ذرا سہمی رہی۔ یہ کالج یوں بھی پریم نگر کے اندر واقع تھا اور پریم نگر کے مالک و مختار نواب ذوالفقار علی خان مرحوم تھے اور کالج ان کی ہمشیرہ زیب النساء بیگم کا قائم کردہ تھا جو بذاتِ خود پرنسپل تھیں لیکن پھر ہوا یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ رانی پر یہاں کے حالات عیاں ہوتے چلے گئے۔ مہذب اور صاف ستھرے ماحول نے اُس کے اندر کی سہمی ہوئی لڑکی کا ڈر اور خوف اعتماد اور بھروسے میں تبدیل کرنا شروع کر دیا اور وہ دھیرے دھیرے غیر محسوس طور سے نہ صرف کالج بلکہ اپنی پرنسپل کے گھریلو ماحول سے بھی مانوس ہوتی چلی گئی۔ کچھ اور دنوں ہی میں ان کی بیٹی شاہ جہاں اور بھتیجی افروز جہاں کی بے تکلف اور گہری دوست بن گئی۔ من و تو کا تضاد ایسا حرفِ غلط کی طرح مٹا کہ دیکھنے والی آنکھ بہ مشکل محسوس کر پاتی۔

نواب ذوالفقار علی خان کو قدرت نے ایک ہی بیٹے سے نوازا تھا۔ نواب زادہ

دیدار علی خان۔ وہ دو ہی برس کے تھے کہ ذوالفقار علی خان اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

بعض زمانے انسانی زندگی میں ایسے صبر آزما اور دشوار گزار آتے ہیں کہ پے در پے مشکلات اور دشواریوں سے سامنا ہوتا رہتا ہے اور شاید ایسی ہی گھڑیوں کو "آزمائش" کہا جاتا ہے۔

نواب زادہ دیدار علی خان کی چھوٹی بہن صاحبزادی افروز جہاں تو والد مرحوم کے انتقال کے تقریباً چھ سات ماہ بعد پیدا ہوئی تھیں اور اسی جانکاہ موقع پر نواب بیگم بھی ان دونوں بچوں کو داغِ مفارقت دے گئیں۔ ہنستا بستا آشیاں لٹ گیا۔ چناں چہ اس پُر آزمائش دور میں ان دونوں یتیم و یسیر بہن بھائی کی پرورش اور ذمہ داری نواب ذوالفقار علی خان مرحوم کی ہمشیرہ زیب النساء بیگم کے حصے میں آئی۔ یوں ان دونوں کی نگہداشت اور پرورش انہی کے ہاتھوں ہوئی لیکن اس فرض کو انہوں نے بہت خوش اسلوبی سے نبھایا۔

زیب النساء بیگم کی زندگی سے بھی قدرت نے عجب ستم روا رکھا تھا۔ ان کی شادی خاندان میں ہی ان کے سگے پھوپھی زاد سے ہوئی تھی مگر ان کے شوہر کچھ ایسے منچلے اور شاہانہ مزاج کے آوارہ گرد سیاح واقع ہوئے تھے کہ انہیں یورپ کے سوا دنیا کا کوئی گوشہ نہ بھاتا تھا۔ ہر سال عرصے سے دنیا بھر کی سیاحت کرتے، سیاحت کے عرصے لوٹتے اور پھر یورپ میں جا نکلتے۔ سال دو سال بعد ایک آدھ ماہ کے لیے گھر کا چکر لگا جاتے۔ اللہ اللہ اور خیر صلا۔

جس زمانے میں نواب صاحب اور بیگم نواب دنیا سے سدھارے، خود زیب النساء بیگم کی اکلوتی بیٹی شاہ جہاں بھی ذرا سی تھی۔ چنانچہ چچا انہوں نے بیٹی اور بھتیجی کو ایک جیسا پیار دے کر بیک وقت پالا تھا۔ صاحبزادہ دیدار علی ان دونوں لڑکیوں سے بڑے تھے۔ دونوں لڑکیاں ہم عمر بھی تھیں تو ہمشیرہ بھی۔ بڑا مشکل اور کٹھن وقت تھا۔ یہ

بیٹوں بچے تھے اور زیب النساء بیگم تنہا۔

تقریباً اٹھارہ برس قبل جب نواب صاحب بقیدِ حیات تھے تو پریم گڑھ کے حالات دیکھنے ہی کے لائق تھے۔ وہ ذاتی طور پر انتہائی نفیس، با اخلاق اور نیک انسان تھے۔ وہ صرف کنبہ پروری نہ تھے بلکہ اپنی جاگیر کے ہر دل عزیز حاکم تھے۔ پریم گڑھ کے علاوہ اپنی دیگر دیہی اور شہری املاک پر اپنے مرکز پہ بیٹھے بیٹھے ایک گہری نظر اور مکمل کنٹرول رکھتے تھے۔

ان کی سب سے بڑی انسانی خوبی یہ تھی کہ وہ ذاتی، خاندانی، حسب و نسب اور دولت کی تفریق کے تعصب سے پاک ذہنیت کے مالک تھے۔ یہی سبب تھا کہ ان کے زیرِ سایہ رہنے والے ان کے عزیز و اقارب، ان کے بہن بھائی، ان عظیم اور اعلیٰ و ارفع خوبیوں سے خالی نہ رہے تھے۔ ایسے عظیم الشان محل اور جاگیر کے مکین اتنے سادہ لوح اور غرور و تکبر سے پاک تھے انہیں قریب سے دیکھنے والی آنکھ اور پرکھنے والے ذہن انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔

ان کی وفات کے بعد حالات پر اثر پڑنا ایک لازمی امر تھا۔ تاہم زیب النساء بیگم کی دور اندیشیوں اور معاملہ فہمی نے حالات کو سنبھالا دیا اور رفتہ رفتہ اپنی پرانی ڈگر پہ دوبارہ چل نکلے۔ یہاں انہوں نے ایک دور اندیشی مزید اور بروقت کی اور وہ یہ کہ ضروری اور اہم ترین مذہبی تعلیمات سے روشناس کرانے کے بعد صاحبزادہ دیدار علی خان کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے یورپ بھیج دیا۔ وہاں ان کی رہنمائی اور نگرانی کے لیے ان کے پھوپھا میاں موجود ہی تھے مگر و تردد کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ اس طرح صاحبزادے بننے اور بگڑنے کی عمر یورپ میں گزار آئے تھے۔ یہاں کے خوشامدانہ اور چاپلوسی کے ماحول، دولت کی ریل پیل اور نوابانہ ٹھاٹھ باٹ و لاڈ پیار سے علیحدہ تعلیم و تربیت نے ان کو ان کی پھوپھی زیب النساء بیگم کے تصورات کے مطابق ڈھالا

تھا۔ اب جبکہ وہ بہترین انسانی اوصاف، بلند کردار اور انسانی اقدار کے قدر دان اور مہذب سوسائٹی کے روحِ رواں بن کر لوٹے تھے کیونکہ یورپ میں جہاں ان کے پھوپھا ان کے راہبر ہی نہیں بہترین دوست اور ساتھی بھی تھے۔

یہ پوری نواب فیملی انسانی قدروں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ نئے زمانے کے نئے اُصولوں اور اہم ترین تقاضوں کو بھی اپنائے ہوئے تھی۔ انہیں کسی بات میں پیچھے رہ جانا قبول نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بچوں کے بڑے ہوتے ہی زیب النسا بیگم نے "قصرِ ویدار" کے قریب ایک وسیع و عریض قطعۂ زمین ہموار کروا کے لڑکیوں کے لیے ایک عظیم الشان عمارت بنوا کر کالج منظور کروا لیا تھا۔ دور سے آنے والی لیکچرز اور طالبات کے لیے ہوسٹل کی علیحدہ عمارت، ان کے طعام و قیام کے علاوہ کھیل کے میدان اور ایک تفریحی کلب کا انتظام کیا تھا۔ یہاں اساتذہ اور طالبات کے لیے غیر مشروط طور سے قیام و طعام کے انتظامات انتہائی آسان اور تقریباً بلا معاوضہ رکھ کے زیب النسا بیگم نے ایک قابلِ قدر مثال قائم کی تھی۔ ایسی مثال جس کی نظیر ملنی ناممکن ہوتی ہے۔

پھر اُن کا پرنسپل کے عہدے پر بلا معاوضہ خدمات انجام دینا گو کہ یہ سب ان کے کسی دیرینہ شوق کی تکمیل کا باعث بنے تھے۔ تاہم ایسے تعمیری انداز میں سوچنا اور پھر اس سوچ کو عملی جامہ اس کے خطیر اخراجات کے ساتھ پہنانا معمولی کام نہ تھا۔ خاندانی نوابوں کے رسم و رواج اور پُرانی روایات کے خلاف یہ ایک انتہائی جرأت مندانہ اقدام تھا مگر وہ اس امتحان میں بھی پورے نمبروں سے کامیاب رہیں۔ آج اُن کے ان اقدامات کے قدر دانوں کی بھی کمی نہ تھی ہر جگہ سراہی جاتیں۔ وہ خود بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ تھیں اور اپنے پرائے سب کے بچوں کو بھی بہترین تعلیم سے روشناس کرا رہی تھیں۔

شاہراہِ حیات کے اُس ناقابلِ فراموش موڑ پر جب نواب ذوالفقار کی اچانک

جدائی نے کہرام بپا کر ڈالا تھا اور تینوں بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ غم بالائے غم یہ کہ اور ان کے میاں بھی چند ماہ ان کے غم میں برابر کے شریک رہنے کے بعد حسبِ معمول ایک بار پھر سیاحت کو نکل گئے تھے۔ اگر کوئی معمولی اعصاب کی خاتون ہوتیں تو لمحہ لمحہ مرتیں اور جیتیں مگر انہوں نے صبر و تحمل، حوصلے اور امید کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیا اور اپنے آہنی ارادوں کے بل بوتے پر حالات کے خلاف چٹان کی طرح سینہ سپر رہیں اور بالآخر بادِ خزاں نے بہاروں کے نوخیز جھونکوں کا روپ دھار لیا اور ان کی امیدوں اور ارمانوں کا گلستان لہلہا اٹھا۔ ہر طرف بہاروں کی روپہلی اور سحر آفریں کلیاں چٹک اٹھیں اور صحنِ گلشن میں پھولوں کے انبار لگتے چلے گئے۔

ان کے کالج کا شمار بہترین کالجوں میں ہونے لگا۔ اُن کا نام آئے دن اخبارات کی زینت بنتا ... لوگ تعریفیں کرتے نہ تھکتے مگر خود ان کے اندر احساسِ تفاخر یا غرور و تکبر کا ذرہ بھر شائبہ تک نہ تھا۔ اک بے پناہ بردباری اور حلم کو چھو لینے والا وقار تھا جو ان کی شخصیت کا احاطہ کیے رہتا۔

اور رانی ..... وہ پرستش کی حد تک ان کی مداح تھی۔



دن کے دس بجے تھے تیز چلچلاتی ہوئی زرد زرد دھوپ ہر طرح پھیلی ہوئی تھی۔ عام دنوں کی نسبت آج کا دن زیادہ ہی گرم لگ رہا تھا' جسم و جاں سے گرمی کی لپٹیں سی اُٹھتی لگ رہی تھیں۔ پہلا پیریڈ ختم ہوتے ہی رانی نے اسٹاف روم کا رُخ کیا۔ پیاس سے چٹخے ہونٹ خشک کرتی وہ کولر سے ہٹی ہی تھی کہ اپنی پرنسپل سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

"رانی بیٹی! آپ سیدھی گھر چلی جائیں۔ لڑکیاں کئی دنوں سے انتظار کر رہی ہیں۔ آپ کے پیریڈ مسز جوزف کر لیں گی۔" انہوں نے ایک لمحہ تھم کر اُسے ہدایت کی اور آگے بڑھ گئیں۔

صاحبزادی افروز جہاں سے کیا ہوا وعدہ اُسے یاد تھا۔ وہ خود بھی وہاں جانا چاہ رہی تھی۔ لہٰذا فوراً سے پیشتر "قصرِ دیدار" چل دی۔ رہائشی عمارت میں داخل ہونے سے پہلے ہی صاحبزادی کی ملازمہ نے اُسے بتا دیا کہ وہ پائیں باغ میں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔

رانی جانتی تھی وہ زرد گلابوں کی دیوانی ہے اور اس وقت اپنے پھولوں سے

گھرے جھکی جھکی ٹہنیوں والے کنج میں ٹیپ ریکارڈ اور پسندیدہ نغموں سمیت موجود ہوگی اور حقیقت بھی یہی تھی۔

افروز جہاں سبزے پر نیم دراز موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ خود رانی بھی عمر کے اس دور سے گزر رہی تھی جہاں لڑکے لڑکیاں راگ رنگ سے فیض یاب ہونا اپنا پیدائشی حق سمجھنے لگتے ہیں مگر ان لمحوں میں صورتِ حال مختلف تھی۔ اُس نے نیچے جھک کر ٹیپ ریکارڈ کے بٹن پر ایک اُنگلی سے دباؤ ڈالا اور خود حرے سے سنگِ مرمر کی بنچ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

فضائیں یک لخت خاموش ہو گئیں۔

افروز نے چونک کر رانی کی طرف دیکھا اور چہک کر بولی۔ "آ خاہ! تو مہارانی تشریف لے آئیں۔ کیسے سرکار! کیسے مزاج ہیں۔ عید کا چاند ہو گئیں حضور تو!"

"مزاج بھی بخیر ہیں اور عید بھی نزدیک ہے اس لیے چاند بن جانے میں بھی کیا مضائقہ ہے۔" رانی نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔

"ہاں آپ فرمائیے ٹیلیفون پر اشتہار بازی کس خوشی میں ہو رہی تھی؟"

افروز نے بہ مشکل ہنسی ضبط کی اور بناوٹ سے بولی۔ "اللہ بھئی! ہمیں تو کمروں میں بڑی گھٹن محسوس ہو رہی تھی اس لیے یہاں گھنی چھاؤں میں آ بیٹھے۔ تم کہو تو اندر چلتے ہیں۔"

"کیا مصیبت ہے!" رانی اس کی بے نیازی اور بے پرکی اُڑانے پر جھلا گئی۔ "آپ کو شوخی سوجھ رہی ہے اور میری جان پر بنی ہے۔ جلدی بتائیے وہ کل والی بات بھول بھی جاتا ہے۔"

"تو جاؤ! روکا کس کافر نے ہے؟" وہ اُسی بے نیازی سے بولی۔

"اور...... وہ بات؟" رانی پوری طرح سنجیدہ تھی۔

"کون سی بات!" تجاہل عارفانہ برقرار تھا۔

"وہ..... جو آپ کو کسی "مہاراجا" نے بتائی تھی۔" رانی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"کیا کہا.....؟ مہاراجا؟ واہ وا..... کیا کہنے ہیں..... سبحان اللہ..... صدقے جایئے ان خوش گمانیوں کے۔" افروز جہاں سے مزید برداشت نہ ہو سکا اور پیٹ میں اُٹھنے والی ہنسی کے گولے آزاد ہو گئے۔

اب صاحبزادی شاہ جہاں بھی آ کر شریک محفل ہو گئی تھی۔ ان دونوں کے قہقہوں سے پائیں باغ کا یہ پھولوں بھرا گوشہ گونج اُٹھا۔

رانی ان قہقہوں کے درمیان بوری صورت بنائے بیٹھی رہی۔ جلد ہی شاہ جہاں کو اس کی بوریت کا احساس ہو گیا۔

"بھئی کمال کرتی ہو رانی تم بھی! اتنی بنڈل پر ایمان لے آئیں تم؟"

"کیوں جی؟" رانی نے افروز جہاں کو گھور کر دیکھا۔

افروز جہاں جھٹ آداب بجالائی اور شرارت سے ترنم کے ساتھ گویا ہوئی۔

"جو..... فون تھا اک بہانہ تھا..... اس بہانے تجھے..... بلاتا تھا.....
اور سنا کر یہ..... سارے "ریکارڈ" تجھے.....
تیرے احساس کو..... جگاتا تھا۔"

اس تک بندی پر رانی کو بھی ہنسنا پڑا مگر جانے کیوں اُسے لگ رہا تھا جیسے دونوں اس سے کوئی بات چھپا گئی ہیں۔ گہری دوستی کی بنا پر وہ ان لوگوں کی رگ رگ سے واقف تھی۔

اُسی شام قصر دیدار سے نکل کر شام کے تقریباً پانچ بجے رانی بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کر رہی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب میلوں تک نواب فیملی کی اراضی

ہوئی تھی۔ کہیں کہیں خریف کی فصل کے لیے خالی پڑے کھیتوں کو تیار کیا جا رہا تھا۔ کہیں کپاس، کماد اور باجرے کی بوائی ہو رہی تھی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، اُسے ہول سی ہو رہی تھی، کچھ دن پہلے کا واقعہ یاد آ رہا تھا جب بس کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا مگر ہر دفعہ ایک ہی واقعہ تو وقوع پذیر نہیں ہوتا۔

آج جلدی ہی بس مل گئی۔ بس میں سوار ہوتے ہوئے اُس نے دیکھا لمبی سی خوب صورت گاڑی بہت سست رفتاری کے ساتھ اُس کے قریب سے گزری اور گہری گہری بھوری آنکھوں والا شخص اُسے بغور دیکھتا چلا گیا۔ وہی اَن جانا اور اجنبی سا شخص جس کا نام تک پوچھنا وہ بھول گئی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد اماں بی سونے کے لیے لیٹ گئیں تو رانی اور شرمین ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے برآمدے کی سیڑھیوں پر آ بیٹھیں یہ روزانہ کا معمول تھا اُن کا۔ چاند ابھی نہیں نکلا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پرسکون تاریکی روح میں اُتری جا رہی تھی۔ بعض اوقات اُجالوں کے بجائے اندھیرے ہی کو کتنے بھلے لگتے ہیں! یوں لگتا ہے جیسے ہم جو کچھ سوچ رہے ہیں، ہماری تصور کی آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے، باقی ساری کائنات اُس سے بے خبر ہے۔ یہ احساس ہی کتنا اپنا سا اور سکون بھرا ہوتا ہے!

رانی خیالات کی یلغار سے نکلی تو شرمین کو کہتے سنا۔ "آپ کو خبر ہے آپی! آج علی بھائی پھر آئے تھے۔"

"کون علی بھائی؟" رانی نے بہت چونک کر بڑی حیرت سے پوچھا۔

"ارے آپ اتنی جلدی بھول گئیں؟ وہی جو اُس روز آپ کو ڈراپ کرنے آئے تھے۔" رانی کی حیرت برقرار رہی لیکن شرمین سخت ناراض تھی۔ اُسے اپنی آپی کی اس بھولنے والی عادت سے چڑ تھی۔

رانی کے ذہن کو شدید جھٹکا محسوس ہوا۔ جی کو ایک بے چینی سی لگ گئی۔ تیزی سے پوچھا۔ "تمہیں...... اُن کا نام کس نے بتایا؟"

"کمال کرتی ہیں آپی آپ بھی!" شرمین نے چڑ کر ناراضگی سے جواب دیا۔

"نام تو وہ اپنا خود اس روز بتا کر گئے تھے اور کون بتاتا بھلا!"

"اچھا...... تو پھر آج کیوں آئے تھے؟" رانی ابھی تک بوکھلائی ہوئی سی تھی۔

اب شرمین کو اس کی بے خبری پر ہنسی آ گئی۔ مذاق اُڑا کر بولی۔ "ملنے آئے تھے اماں بی سے اور کیوں آئے تھے۔ وہ تو آج میں اسکول سے جلدی آ گئی تھی تو مل گئے مجھ سے بھی ورنہ اماں بی کہتی ہیں وہ اکثر ملنے آتے رہتے ہیں اُن سے۔"

"ہائیں...... اماں سے ملنے آتے رہتے ہیں؟" رانی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی۔

شرمین اس کی کیفیت سے بے پروا اپنی دھن میں بولتی رہی۔ "ویسے آپی! بڑے لاجواب ہیں علی بھائی۔ اتنا ہنساتے ہیں...... اتنا ہنساتے ہیں کہ پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔ بہت مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں' پتا ہے کہہ رہے تھے تمہاری آپی تو خود اتنی سی ہیں...... جتنی سی وہ کیا لیکچر دیتی ہوں گی لڑکیوں کو...... اُلٹا انہی سے ٹافیاں کھا کر آ جاتی ہوں گی۔"

رانی کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

اندھیرے میں اس کی مدھم سی مدھری آواز سن کر شرمین مزید شیر ہو گئی اور اس کا ہاتھ تھام کر بتانے لگی۔ "اور پتا ہے آپی...... علی بھائی کہہ رہے تھے تمہاری آپی کے پاس تو ایم۔ اے کی نقلی ڈگری ہے۔ وہ سچ مچ اتنا پڑھی ہوئی تھوڑی ہیں۔ خالی خولی رعب جماتی رہتی ہیں۔ تم بالکل ان کا کہنا مت مانا کرو۔ تم سے تو وہ بالکل بڑی نہیں لگتیں۔"

شرمین کے انکشافات اُسے حیرت میں مبتلا کیے دے رہے تھے۔ تعجب کی بات تو تھی کہ آخر اماں بی کو کیا ضرورت تھی ایک غیر اور ان جانے شخص سے مراسم بڑھانے کی؟ خبر نہیں کون اندر سے کیا ہو' کیا چاہتا ہو! بھلا کوئی کسی کے اندر تک کس طرح جھانک سکتا ہے۔ جتنا خطرناک زمانہ اتنے تشویش ناک حالات مگر جانے کیوں کوئی بہت اندر سے اُسے تسلیاں دیے جا رہا تھا۔ "چاہے کوئی بھی ہو وہ بہت شریف' بہت سچا شخص ہے۔"

بعض انسانوں کی زندگی آزمائشوں سے عبارت ہوتی ہے۔ رانی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا جن کی زندگی پے در پے مشکلات اور آزمائشوں سے پُر ہوتی ہے۔

کم سنی کے دور سے ہی قدرت نے اُس پر کئی ستم کر ڈالے تھے لیکن جب بہت ننھی سی تھی تو گھر کا ماحول بہت پُر سکون' خوب صورت اور آسودہ ہوا کرتا تھا۔ تب تک تو گمان بھی نہ تھا کہ آگے تقدیر کیا کرنے کو ہے۔ اماں ابا دونوں ہی بڑے پیار کرنے والے' ناز اُٹھانے والے اور ہر فرمائش پوری کرنے والے تھے۔

ابو ایک مصروف آرمی آفیسر ہونے کے باوجود اپنی فرصت کا ہر لمحہ گھر پر گزارنا پسند کرتے تھے۔ لمبے چوڑے' صحت مند اور گورے چٹے سے ابو اُسے بہت ہی اچھے لگا کرتے تھے۔ اماں بی سے بھی زیادہ اچھے۔ بچوں کی مانند اُس کے ساتھ خوب کھیلتے۔ گدگداتے' ہنساتے۔ ہر گھڑی توجہ دینے والے۔ بعض اوقات وہ انہیں اخبار تک نہ پڑھنے دیتی اور وہ ذرا منائے بغیر' اپنی پوزیشن اور قد و قامت فراموش کیے پیچھے کے بل گھوڑا بنے ڈرائنگ روم کے قالین پر اُسے لادے سارے میں دوڑتے پھرتے۔ کبھی کبھی تو اس کے ساتھ گڑیاں کھیلنے بھی بیٹھ جاتے۔

اماں بی یوں تو بہت ہی فرماں بردار بیوی اور پیار کرنے والی ماں تھیں' بے حد نرم

دل نرم خو اور ہر کسی کا خیال رکھنے والی مگر انہیں اس وقت جانے کیا ہو جاتا جب ابو انہیں باہر کہیں لے جانے پر اصرار کرتے۔

لیکن اس ایک بات پر وہ بے طرح چڑتی تھیں۔ وہ بازاروں ریستورانوں سے باہر ادھر اُدھر کھلے عام سیر سپاٹوں کو بہت معیوب تصور کرتی تھیں۔ کسی گیٹ اٹینڈ کرنا تو ان کے نزدیک بدترین گناہ تھا۔

وہ سارا وقت گھر پر ہی مزے سے گزارتیں اور کئی ملازموں کے ہوتے ہو بھی مختلف کاموں میں اُلجھی رہتیں۔ وہ گھر کے اندر ہی رہنا پسند کرتیں، باہر کہیں پسند نہ کرتیں۔ وہ یہاں تک نئی تہذیب اور اس کے تقاضوں سے متنفر تھیں کہ ابو بے حد اصرار کے باوجود رانی کے منہ سے اپنے لیے "ممی" کا لفظ بھی برداشت نہ کرتی تھیں اگر رانی کبھی دوسرے لوگوں کے بچوں کی دیکھا دیکھی لاڈ میں آ کر "ممی" کہہ مخاطب کر لیتی تو بلا لحاظ کیے اُسے بے نقط سنا ڈالتیں۔

بسا اوقات جانے کیوں ابو کو ڈھیروں غصہ آ جاتا۔ چہرہ بہت ہی زیادہ تپ سُرخ ہو جاتا۔ ڈرائنگ روم کی آرائشی اشیاء اُٹھا اُٹھا کر ادھر اُدھر پھینکنے لگتے۔ اماں دھیمے سروں میں کوئی بات کہہ کر کچن میں جا گھستیں اور ابو زور زور سے بولنے لگتے قالین پر پاؤں پٹخ پٹخ کر چلتے۔ سر سے پاؤں تک اُن کی ہر جنبش اُن کے بے پناہ جلال کی مظہر بن جاتی مگر ایسے خطرناک موڈ میں بھی رانی سے کبھی پیشانی پر بل ڈال کر نہیں مخاطب ہوئے۔ اس سے ان کی محبت اور اُلفت میں ذرہ برابر کمی نہ آنے پاتی۔ پھر خو بخود ہی اُن کا غصہ اور بے پناہ جلال دھیما پڑ جاتا۔ اماں بی سے کچھ کہے سنے بغیر رانی کی انگلی پکڑے جیپ میں جا بیٹھتے اور اُسے پورا شہر گھما لاتے۔ کون کھلاتے، تصاویر والی کتابوں، بہت سارے کھلونوں کے ساتھ رنگین تتلیاں، جوتے، ربن، ہیئر بینڈ، ہو جھلمل کرتے بے بی فراکوں کی شاپنگ کے بعد رات گئے گھر لوٹتے اور اماں بی کی

صورت دیکھے بغیر بیڈ روم میں چلے جاتے۔

زندگی کے اُس دور میں وہ واقعی نا سمجھ، معصوم اور کم سن تھی کہ گھر کے ماحول میں آئے دن رونما ہونے والے ایسے واقعات کی گہرائی تک پہنچنے کی صلاحیت سے بے بہرہ تھی۔ اُس کی نادانی کی انتہا یہ تھی کہ لاشعوری طور پر وہ ایسی "آن بن" کی منتظر رہا کرتی کیوں کہ ایسی "جھڑپ" کے فوراً بعد تو اُس کی گویا عید ہو جایا کرتی تھی۔

ابتدائی عمر کے بہت سارے دن ایسے ہی عجیب معمولات کی نذر ہوتے گئے اور وقت آگے بڑھتا گیا۔ وہ چار برس کی ہوئی تو اماں بی نے اُس کے لیے ایک بزرگ بی بی کا انتظام کیا جو صبح و شام اُسے دینی علوم کا درس دینے آنے لگیں۔ وہ بڑے اہتمام اور ذوق و شوق سے ان کے سامنے ننھا سا دوپٹہ لپیٹ کر بیٹھنے لگی۔ بڑی سنجیدگی اور متانت سے ہل ہل کر سبق یاد کرتی۔ اماں بی اُس کی بھولی بھالی ادائیں دیکھ دیکھ کر پھولے نہ سماتیں اور بار بار اُس کی بلائیں لیتی نہ تھکتیں، صدقے واری جاتیں۔

پھر ایک روز ابو نے ایک دوسرا ہی کام کر ڈالا۔ انہوں نے اماں بی کے نظریے کو سمجھنے کی کوشش کی اور نہ اُن سے مشورے کی ضرورت سمجھی۔ ان کی ہستی کو مکمل نظر انداز کر کے رانی کو کانوینٹ میں ایڈمیشن دلوا ڈالا۔

جیسے وہ فقط انہی کی بیٹی ہو۔ اماں بی سے اُسے کوئی تعلق نہ ہو! جس رات کی صبح رانی کو گھر سے ہوسٹل میں منتقل ہونا تھا، اُس رات کے جانے کون سے پہر، تیز قسم کے ہنگامے سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ حیران و پریشان مسہری کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی اور سوئی سوئی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

ابو اور اماں بی کے درمیان بڑی شان دار قسم کی جھڑپ ہو رہی تھی۔ اُس نے پہلی مرتبہ اماں بی کو اونچی آواز میں بولتے سنا۔ اُن کا چہرہ غم و غصے کے اظہار میں تپا تپا سا ہو رہا تھا اور وہ کرسی پر بیٹھی کہہ رہی تھیں۔ "حشر ہو جائے گا میں لڑکی کو آپ کے اُس کا

نوینت میں ہرگز ہرگز نہ کھیجوں گی۔ اب آپ بچی کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں! اُس کو انگریزی پڑھنا ہرگز ضروری نہیں ہے اور وہ بھی گھر سے دُور ہوسٹل میں رہ کر.....
غضب خدا کا آپ کو مشرقی قدروں کا ذرا احساس نہیں رہ گیا۔ بھلا اُس کی عمر ہی کیا ہے! جو آپ اُسے گھر سے بے گھر کیے دے رہے ہیں ——— ہائے معصوم بچی۔"
اتنا کہتے کہتے اُن کی آواز بھیگ گئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔
"آپ کو اگر رونا ہی ہے تو براہِ کرم دوسرے کمرے میں جا کر رو دیجئے بچی کی نیند حرام مت کیجئے۔" رات کے سناٹے میں ابو کی بھاری آواز گونجی۔
سگار کا کش لے کر وہ ٹہلتے ہوئے اماں بی کے قریب رُکے۔ لمحہ بھر انہیں دیکھتے رہے پھر بہت حقارت سے تُرش لہجے میں کہنے لگے۔ "میری زندگی بھر کا الم ناک سانحہ اور بھیانک غلطی یہی تھی قیصر جہاں کہ میں آپ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ لعنت ہو مجھ پر۔"

"کاش! وہ وقت پلٹ کر آ جائے تو میں آپ کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہ کروں کیوں کہ مجھے آپ جیسی جاہلت سے پُر عورت کی ضرورت قطعی نہیں۔ میں ایک دقیانوسیت سے پناہ مانگتا ہوں۔ اتنے عرصے میں میں نے کیا کیا کوشش نہ کر ڈالی کہ آپ کو ہم خیال بنالوں آپ میرے تصورات کے مطابق ڈھل جائیں مگر حقیقت یہی ہے کہ آپ گوشت پوست کی انسان نہیں احساسات اور جذبات سے عاری پتھر ہیں جس سے آج تک میں سر پھوڑتا رہا اور آپ وہی لکیر کی فقیر رہیں۔ آپ کی بے پناہ جہالت کور ذوقی ذہنی پس ماندگی سے میں نفرت کرتا ہوں بے پناہ نفرت اور آج سے عہد کرتا ہوں کہ آیندہ آپ کے معاملات میں کبھی دخل انداز نہ ہوں گا مگر ساتھ ہی آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ میری سوچوں اور میرے ارادوں کے درمیان حائل ہونے کی آپ بھی کبھی کوشش نہ کرنا۔ میں اپنے گھر کا ذمہ دار ہوں اپنی اولاد کی بہبود اور بہتری

کے لیے آپ سے بہتر سوچ سکتا ہوں۔ میں اپنے حقوق اور فرائض کو اچھی طرح پہچانتا ہوں اس لیے کان کھول کر سن لیجئے کہ جو میں چاہوں گا وہی ہو گا بس۔"
"نہیں ..... ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔" اماں بی پھٹی پھٹی آواز میں چلا اٹھیں۔
"میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اپنی بچی کو آپ جیسی بیک ورڈ اور جاہل خاتون کے زیرِ سایہ پرورش پانے دوں..... کیوں کہ سنِ شعور کو پہنچتے پہنچتے آپ یقیناً اُسے اپنے رنگ میں رنگ لیں گی۔ وہ آپ کی فوٹو اسٹیٹ بن جائے گی اور ایسا میں تاحیات نہ ہونے دوں گا۔ میں اپنی بچی کو نئے دور کے نئے تقاضوں کے مطابق اعلیٰ تعلیم و تربیت کے اعلیٰ ترین زیورات سے آراستہ کرنا چاہتا ہوں یہ خیال اس گھر کے جہالت آمیز ماحول میں ہرگز پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ چناں چہ وہ یہاں رہ کر نہیں پڑھے گی بلکہ ہوسٹل میں رہے گی پھر اُس کا رجحان ہو گا تو میں اُسے فارن بھیج دوں گا۔"
"نہیں ..... نہیں۔ آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ میں آپ کو ایسے ستم کی اجازت نہیں دے سکتی۔ کبھی نہیں!"
اماں بی بے تحاشہ چلاتی ہوئی ان کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ ابو نے سگار کی راکھ جھاڑی پھر اُن کی ساری بے تابی اور بے قراری نظر انداز کر کے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولے۔ "میرا فیصلہ آخری فیصلہ ہے جس کو بدلنے کا آپ ہرگز کوئی حق نہیں بلکہ آپ کو اس کے درمیان دخل اندازی کی ہمت بھی مت کریں۔ رانی میری بچی ہے اور میں اس کی تمام تر فلاح و بہبود اور بہتر مستقبل کا ذمہ دار ہوں جو کچھ میں اس کے لیے سوچ چکا ہوں اسی پر عمل کروں گا بلکہ اب تو میں اس کو چھٹی کے دن بھی آپ سے ملنے نہیں دوں گا۔ بس یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔"
"آہ! ——— یہ ظلم ہے ——— سراسر ظلم ——— آپ انسان نہیں بلکہ پتھر ہیں ——— بے حس پتھر ——— سنگ دل ہیں ——— ظالم ہیں ——— آپ کے اندر انسانیت نام کی ——"

نوبنٹ میں ہرگز ہرگز نہ بھیجوں گی۔ اب آپ بچی کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں! اُس کا انگریزی پڑھنا ہرگز ضروری نہیں ہے اور وہ بھی گھر سے دُور ہوسٹل میں رہ کر۔۔۔ غضب خدا کا آپ کو مشرقی قدروں کا ذرا احساس نہیں رہ گیا۔ بھلا اُس کی عمر ہی کیا ہے! جو آپ اُسے گھر سے بے گھر کیے دے رہے ہیں۔۔۔۔ ہائے معصوم بچی۔"

اتنا کہتے کہتے اُن کی آواز بھیگ گئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

"آپ کو اگر رونا ہی ہے تو برائے کرم دوسرے کمرے میں جا کر رو لیجیے بچی کی نیند حرام مت کیجیے۔" رات کے سناٹے میں ابو کی بھاری آواز گونجی۔

سگار کا کش لے کر وہ ٹہلتے ہوئے اماں بی کے قریب رُک کے لحہ بھر انہیں دیکھتے رہے پھر بہت حقارت سے ترش لہجے میں کہنے لگے۔ "میری زندگی بھر کا المناک سانحہ اور بھیانک غلطی یہ بھی تھی قیصر جہاں کہ میں آپ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ لعنت ہو مجھ پر۔"

"کاش! وہ وقت پلٹ کر آ جائے تو میں آپ کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہ کروں کیوں کہ مجھے آپ جیسی جہالت سے پُر عورت کی ضرورت قطعی نہیں۔ میں ایسی دقیانوسیت سے پناہ مانگتا ہوں۔ اتنے عرصے میں میں نے کیا کیا کوشش نہ کر ڈالی کہ آپ کو ہم خیال بنالوں' آپ میرے تصورات کے مطابق ڈھل جائیں مگر حقیقت یہی ہے کہ آپ گوشت پوست کی انسان نہیں' احساسات اور جذبات سے عاری پتھر ہیں جس سے آج تک میں سر پھوڑتا رہا اور آپ وہی لکیر کی فقیر رہیں۔ آپ کی بے پناہ جہالت' کور ذوقی' ذہنی پس ماندگی سے میں نفرت کرتا ہوں' بے پناہ نفرت اور آج سے عہد کرتا ہوں کہ آئندہ آپ کے معاملات میں کبھی دخل انداز نہ ہوں گا مگر ساتھ ہی آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ میری سوچوں اور میرے ارادوں کے درمیان حائل ہونے کی آپ بھی کبھی کوشش نہ کرنا۔ میں اپنے گھر کا ذمہ دار ہوں' اپنی اولاد کی بہبود اور بہتری

کے لیے آپ سے بہتر سوچ سکتا ہوں۔ میں اپنے حقوق اور فرائض کو اچھی طرح پہچانتا ہوں اس لیے کان کھول کر سن لیجیے کہ جو میں چاہوں گا وہی ہو گا بس۔"

"نہیں۔۔۔۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔" اماں بی بھنچی بھنچی آواز میں چلا گئیں۔

"میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اپنی بچی کو آپ جیسی بیک ورڈ اور جاہل خاتون کے زیر سایہ پرورش پانے دوں۔۔۔۔ کیوں کہ سن شعور کو پہنچتے پہنچتے آپ یقیناً اُسے اپنے رنگ میں رنگ لیں گی۔ وہ آپ کی فوٹو اسٹیٹ بن جائے گی اور ایسا میں تا حیات نہ ہونے دوں گا۔ میں اپنی بچی کو نئے دور کے نئے تقاضوں کے مطابق اعلا تعلیم و تربیت کے اعلا ترین زیورات سے آراستہ کرنا چاہتا ہوں یہ خیال اس گھر کے جہالت آمیز ماحول میں ہرگز پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ چناں چہ وہ یہاں رہ کر نہیں پڑھے گی بلکہ ہوسٹل میں رہے گی پھر اس کا رجحان ہو گا تو میں اُسے فارن بھیج دوں گا۔"

"نہیں۔۔۔۔ نہیں۔ آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ میں آپ کو ایسے ستم کی اجازت نہیں دے سکتی۔ کبھی نہیں!"

اماں بی بے تحاشہ چلاتی ہوئی ان کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ ابو نے سگار کی راکھ جھاڑی پھر ان کی ساری بے تابی اور بے قراری نظر انداز کر کے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولے۔ "میرا فیصلہ آخری فیصلہ ہے جس کو بدلنے کا آپ ہرگز کوئی حق نہیں بلکہ آپ کو اس کے درمیان دخل اندازی کی ہمت بھی مت کریں۔ رانی میری بچی ہے اور میں اس کی تمام تر فلاح و بہبود اور بہتر مستقبل کا ذمہ دار ہوں جو کچھ میں اُس کے لیے سوچ چکا ہوں اسی پر عمل کروں گا بلکہ اب تو میں اس کو چھٹی کے دن بھی آپ سے ملنے نہیں دوں گا۔ بس یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔"

"آہ! یہ ظلم ہے۔۔۔۔ سراسر ظلم۔۔۔۔ آپ انسان نہیں بلکہ پتھر ہیں۔۔۔ بے حس ہیں۔۔۔ سنگ دل ہیں۔۔۔ ظالم ہیں۔۔۔ آپ کے اندر انسانیت نام کی"

"شٹ اَپ...... میں کہتا ہوں بند کرو یہ بکواس۔" ابو کا چہرہ تمتما اُٹھا اور ہاتھ "چٹاخ" کی زوردار آواز کے ساتھ اماں بی کے رُخساروں پر جا پڑا۔

رانی کے ہاتھ پیروں کا دَم نکل گیا۔

وہ دھم سے بستر پر گری اور تکیے سے بری طرح چمٹ گئی۔

وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ انتہائی خوف اور گھبراہٹ سے اُس کی ننھی سی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ اِس نئی قسم کی واردات اور آنکھوں دیکھے ستم پر اُس کی آنکھوں کے آنسو تک خشک ہو گئے تھے۔ کیا آنکھوں نے دیکھا تھا اور کیا کانوں نے سنا تھا۔ دونوں تو ناقابلِ یقین اور ناقابلِ تردید واقعات تھے۔

اُس رات اُس کا ننھا سا ذہن سُن ہو کر رہ گیا۔

ابو کے اُس خطرناک رُوپ نے اسے سہما کر رکھ دیا۔ اپنی دانست میں وہ اسی کی بہتری کے لیے یہ اقدام کر رہے تھے مگر ان کے انداز تیور اور جارحانہ رویّہ ہمیشہ کے لیے ننھی سی رانی کے دل و دماغ پر ایک گہرا اور ان مٹ نقش بن کر ثبت ہو گیا۔ لڑنے والے دونوں فریق بچی کی ذہنی اذیت اور روحانی کرب سے بے خبر اپنے اپنے موقف پر شدومد سے ڈٹے ہوئے تھے۔

دوسری صبح رانی کی آنکھ کھلی تو سب سے پہلے رات کا آنکھوں دیکھا واقعہ ذہن کی اسکرین پر بڑے واضح انداز سے چلنے لگا۔ اُس نے گھبرا کر کمرے میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ ذہن کو زبردست شاک لگا۔ وہ آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگی مگر منظر تبدیل نہ ہوا۔ اماں بی دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھ پونچھ کر بڑے سے اٹیچی میں اس کے ننھے منے خوش رنگ لباس اور کتابیں کاپیاں رکھ رہی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور میاں کے فیصلے پر لبیک کہہ کر اپنے سینے پہ پتھر کی سِل رکھ لی تھی۔

روتے دھوتے انہوں نے اپنی لختِ جگر کو اپنے ہاتھوں بنا سنوار کر ہاسٹل بھیج دیا اور خود یہاں سے وہاں تک سنسان اور ویران پڑی کوٹھی میں بے چین و بے قرار روح کی طرح اُجاڑ دن گزارنے لگیں۔

زندگی نے اپنا راستہ از خود بنا لیا اور خاص ڈگر پر چل نکلی۔

رانی ہوسٹل کی دل چسپیوں اور گہما گہمی میں ڈوبتی اُبھرتی رہی۔ بننے سنورنے کا عمل طویل ہوتا گیا یوں لگا جیسے وہ ہوسٹل میں پیدا ہوئی ہوسٹل ہی میں تاحیات رہے گی اور یہیں مر کھپ جائے گی۔

ابو نے واقعی اپنا کہا پورا کر دکھایا تھا۔ ہر ہفتے خود ہی اکیلے اُس سے ملنے چلے آتے۔ ڈھیروں فروٹ، کتابوں، کھلونوں اور رنگا رنگ پیکٹوں سے لدے پھندے جیسے بس رانی کو انہی چیزوں کی ضرورت ہو۔ اسے کسی بھی چھٹی پر گھر لے کر نہ جاتے اور نہ ہی اماں بی سے ملنے کی اجازت دی۔ دونوں ماں بیٹی کیسے کیسے نہ تڑپی ہوں گی؟ رانی کی تو خیر بہت سی پیاری پیاری دوست بھی بن گئی تھیں۔ بہلانے، پیار کرنے اور ناز اُٹھانے کو صاف ستھری تعلیم یافتہ گورنس بھی تھیں۔ پڑھنے لکھنے اور کھیلنے کودنے کے اتنے مواقع کم کم ہی میسر آتے لیکن جب ماں اور اُس کی دل داریاں یاد آتیں تو بے چین ہو جاتی۔

اماں بی کو تو وہ پل پل یاد آتی۔ وہ جدائی کے لمحات، کانٹوں کی سیج پر تڑپ تڑپ کر گزار رہی تھیں۔ جاڑے کی لمبی راتیں اور گرمی کے طویل دن آزمائش بن کر گزر رہے تھے۔ وقت بوند بوند بن کر ٹپک رہا تھا۔ ماں بیٹی کے درمیان وقت دو دھاری تلوار کی مانند حائل تھا مگر ظلم رُت مہربان نہ ہوتی تھی۔ دل پہ لگے گھاؤ گہرے ہی ہوتے گئے، مندمل ہونے کے آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ ابو پر ضد اور ہٹ دھرمی کا بھوت سوار تھا۔ شاید ان کی فطرت میں سختی تھی بلکہ سخت دلی کی انتہا بھی ان پر۔ ایک دن

اچانک ہی وہ رانی کو لینے آ گئے وہ حیران رہ گئی اُسے یاد آ گیا کہ وہ ایک عدد ماں بنی بھی ہے یہ مقدس و محترم ہستی کہیں نہ کہیں موجود ہے جو دن رات کے ہر لمحے اور گھڑی میں اس کی راہ تکتی رہتی ہے۔ حیران وہ اس تبدیلی پر بھی تھی کہ اُس نے ابو کو ایسا خوش، پر جوش اور مگن نہیں دیکھا تھا اور اس بے پناہ خوشی اور سرمستی کا رد عمل جا کر نکلا۔

اُجلی اُجلی مسکراہٹوں والی نرس نے کمبل میں لپٹا ہوا ننھا سا گلابی گلابی راجا اُس کے سامنے کر دیا۔ پل بھر میں وہ اپنے چاؤ سے چلنے والے سارے قیمتی کھلونے بھول بیٹھی۔

لیکن سفید بڑی بی اماں کو شاید راجا بھیا سے بھی زیادہ خوشی اُس سے مل کر ہوئی تھی۔ بیڈ پر لیٹے ہی لیٹے انہوں نے اپنے تمام دُکھ بھلا کر اُسے کلیجے سے لپٹا لیا۔ جلی ہوئی پیاسی آنکھوں سے قطرہ قطرہ خونِ جگر یوں جھر جھر ٹپکا کہ ابو نے بے ساختہ ڈھیر ڈھیرے ندامت اور پشیمانی کے کسی شدید احساس سے مغلوب ہو کر دونوں ہاتھ اماں بی کے شانوں پر رکھ دیے۔

وہ تینوں کے تینوں آپس کے سچے رشتے کو پہچان کر کیسے آپس میں مل بیٹھے تھے ساری رنجشیں، ساری کدورتیں اور سارے اختلافات اک ننھے سے وجود نے آ کر ڈالے تھے۔ ابو کے تو گویا مارے خوشی کے پاؤں زمین پر نہ لگتے تھے۔ انہیں بیٹا ہونے کا دُکھ بھی تو کتنا تھا۔ اس ایک محرومی نے انہیں کیسا چڑچڑا اور اماں بی کے وجود سے بے نیاز اور بے پروا کر رکھا تھا حالاں کہ اس میں اماں بی بے چاری کا کیا دوش تھا قدرت کے سامنے جیسے یہ بے بس تھے اسی طرح وہ بھی مجبور تھیں۔

ہزار تعلیم یافتہ ہونے اور روشن خیالی کے باوجود تھے تو آخر مرد ہی نا۔ شادی کے بعد جس کی سب سے بڑی خواہش ایک عدد بیٹے کیلئے زندہ جاوید وارث کے روپ

میں ڈھل کر رہ جاتی ہے اور خود چاہے ورثے میں کرائے کا مکان ہی چھوڑیں لیکن وارث تو بہر حال اُن کو چاہیے۔ بے چاری لڑکیاں بھلا کس طرح وارث قرار دی جا سکتی ہیں؟ ان کے ذریعے کون سا باپ دادا کا نام آگے چلتا ہوتا ہے؟ کہنے والے تو یہ ہی کہتے ہیں کہ جی لڑکی کیا پیدا ہوئی ہماری آدھی مونچھ نیچی ہو گئی اب ہم منہ کسی کو کیا دکھائیں! کیسے دکھائیں! لڑکی ذات کی پیدائش سے کون سا شان میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ مزید پریشانیاں اور مستقبل کے تفکرات ہی آن گھیرتے ہیں۔ ہائے کل کو پیسہ ہو یا نہ ہو، نہ جانے شادی کا کیا ہو گا؟ کیا کریں گے! وغیرہ وغیرہ۔

جب کہ لڑکے کی پیدائش کے تو تصور سے ہی خوشی کے بینڈ باجے بجنے لگتے ہیں۔ حضرت انسان مسرتوں کے ساتویں آسمان سے چھٹا خوش آئند مستقبل کے تانے بانے بننے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ امیدوں اور ارمانوں کی ایک نئی دنیا کی آبیاری ہونے لگتی ہے۔ باپ ہو خواہ ماں خوشی کے اس عظیم موقع پر ایک جیسے ہی احساس سے مغلوب ہوتے ہیں حالاں کہ یہ خوشی جھولی میں ڈالنا یا نہ ڈالنا سراسر اُس قدرت والے کے اختیار میں ہوتا ہے جو جزا و سزا کا مالک و مختار ہے۔

اماں بی کی جہالت اور اعلا سوسائٹی جوائن نہ کرنے کی فرسودہ عادات و فطرت سے قطع نظر، ابو کو ہمیشہ ان سے یہی شکوہ رہا کہ وہ ازدواجی زندگی کے چھ برسوں میں انہیں ایک بیٹے کی خوشی نہ دے سکی تھیں گویا کہ یہ اللہ معاف کرے ان بے چاری کے اختیار میں تھا کہ وہ ان کو بیٹے کے وجود سے محروم رکھے ہوئے تھیں۔ اب کوئی اُن سے پوچھتا کہ بھئی! اگر یہ امر خود اختیاری ہی ہے تو پھر تم خود کیوں نہیں ایک عدد بیٹا بنا لیتے! آخر کو شوق اور ارمان تو تمہارا بھی ہے بیٹے کا باپ کہلانے کا لیکن اب اُن کو کیا کیا جائے کہ ہمارے معاشرے میں ایسے معاملات میں قصوروار عموماً عورت کو ہی ٹھہرا لیا جاتا ہے۔ لڑکے یا لڑکی کی پیدائش کا الزام بڑی سہولت اور بے رحمی کے ساتھ عورت

کے کھاتے میں ڈال کر مرد بری الذمہ ہو جاتا ہے یہ طرزِ فکر صدیوں کا سفر طے کر۔ ہوئے موجودہ دور میں بھی جگہ جگہ نظر آ جاتا ہے۔ شاذ و نادر ہی کبھی کسی نے اس۔ خلاف آواز اٹھائی ہو تو اٹھائی ہو۔

من موہنے بیٹے کی پیاری صورت دیکھ کر ابو نے سارے گلے اور شکایتیں ختم ڈالیں تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی انہوں نے اپنی زندگی کے دیگر معمولات اور ش بچاتے ہنگامے نظر انداز کر کے اماں بی کی اس قدر دل جوئی کی اتنی دل جوئی کی! گذشتہ تمام زیادتیوں اور بھول کی کسر نکال دی۔

اماں بی کو شاہراہِ حیات کا یہ دور خواب سا لگتا۔ انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے ا دم اُن کے سر پر سُرخاب کے پر اُگ آئے ہوں۔

"یا اللہ! میں ایسی معتبر ہو گئی!" بے چاری حیران ہو ہو کر سوچتیں۔ "کیا ج میں پہلی مرتبہ ماں بنی اور رانی میری گود میں آئی تو اُس وقت میرے پاؤں تلے ج نہیں تھی! کیا لڑکے اور لڑکی کا اتنا فرق ہوا کرتا ہے! کیا لڑکیوں کو جنم دیتے د مائیں سو مرتبہ مرتی اور جیتی نہیں ہیں!"

گو کہ رانی کی پیدائش پر بھی انہوں نے کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا تھا پار ایسی بے پایاں مسرت بھی ظاہر نہ کی تھی جو راجا بھیا کو پا کر از خود پھوٹی پڑتی تھی۔

خود رانی کا دل راجا بھیا سے ایسا لگا کہ اُسے ہوسٹل جانا بھی نہ بھایا۔ وہ تھا بھی بہت نرم و نازک اور بھولا بھالا معصوم اور خوب صورت بالکل ابو کی تصویر لگتا۔ وہی خم کھا ہوئے سنہری بال سُرخ و سپید رنگت اور چوڑی و فراخ پیشانی۔

وہ اس ہنستے جاگتے گڈے سے جدا ہونے کو کسی صورت تیار نہ تھی سارا سارا اس کی گود سے لگی رہتی۔ نہ کھانے پینے کی پرواہ رہی تھی نہ لکھنے پڑھنے کی۔ سہ دوستوں اور ہوسٹل کے معمولات کو یکسر بھول بیٹھی تھی۔ اماں بی اس صورت

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

بہت مطمئن اور خوش تھیں مگر ابو بھلا اتنی بڑی تبدیلی کس طرح گوارا کر سکتے تھے۔

مگر وہ بھی کہ بکھری جاتی تھی تب بہ مشکل تمام بصد منت ابو نے اُسے ہفتے کے لئے گھر لاتے رہنے کے پکے وعدے کر کے منایا۔ سو سو خوشامدیں کیں تو وہ واپس انے پر آمادہ ہوئی۔ اماں بی نے اس وعدے کو ہی غنیمت جانا کہ چلو کم از کم ایک دو نوں اور کچھ نہیں تو ہر ویک اینڈ پر اپنی بچی سے مل لیا کریں گی۔ پہلے والی پابندی تو جان چھوٹی تھی ماں بیٹی کی۔

بڑا ہی یادگار اور دل و روح میں چھپ جانے والا دن تھا وہ!

رانی کے پہلے سال کے امتحانات ختم ہونے میں ابھی ایک روز باقی تھا کہ اچانک ہی ابو کے بجائے ان کا ڈرائیور لینے آ پہنچا۔ پرنسپل سے جانے کیا بات ہوئی کیا ال۔ بہر حال اُسے امتحان ہال سے اٹھا کر فوری طور سے گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

اُسے پیپر نہ دینے کا لمحے بھر کو بھی افسوس نہ ہوا۔

گھر جانے سے زیادہ اُسے راجا بھیا سے ملنے اُسے دیکھنے اور پیار کرنے کی تمنا انے کی خوشی تھی۔

اپنے سارے کھلونوں سے بھرا بیگ لیے خوشی خوشی اُچھلتی کودتی گھر میں داخل ل۔ ماں کے بجائے وہ پکار بھی بھائی کو رہی تھی۔ جیسے وہ جہاں کہیں بھی ہو گا اُس کی جواب دے گا یا بھاگ کر اُس سے لپٹ جائے گا۔

راجا بھیا ویسے ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر ہوسٹل گئی تھی ویسا ہی گورا چٹا مسکراتا ہوا مگر ہنس ہنس کر بلانے کے بجائے مُرے سے آنکھیں موندے کوئی ازلی ہی نیند یا سو تھا۔ ایسی ظالم اور ابدی نیند جسے اماں بی کی سسکیاں آہ و زاری اور رانی کی چیخیں بھی سکیں۔ معمولی سا فلو اُسے ہنستے مسکراتے زندہ لوگوں کے درمیان سے بڑی بے ی کے ساتھ اٹھا لے گیا تھا۔ ہفتہ بھر بیمار رہنے کے بعد وہ ہوسٹل واپس لوٹی تو اُس

نے اپنے کھلونے جن سے کھیلنا بہت دنوں سے ترک کر دیا تھا' احتیاط کے ساتھ پونچھ کر دوبارہ شوکیس میں سجا لیے۔ منا سا دل' جو بے طرح ٹوٹ چکا تھا' دوبارہ کے ماحول میں ضم ہوتا چلا گیا۔

ابو نے اب تک ویک اینڈ والی پابندی ہٹا رکھی تھی یا پھر شاید وہ اس سانحہ کے بارِ غم سے ایسے دبے تھے کہ سب کچھ بھول گئے تھے۔ بہرکیف کبھی ڈرائیور کو خود جا کر رانی کو گھر لے آتے مگر اب پہلے والی بات ہی نہ رہ گئی تھی۔ اماں بی خوب پیار کرتیں' سو سو طرح اس کے لاڈ اٹھاتیں' اچھے اچھے کھانے پکا کر اسے کھلا پکا کر اسے کھلانے کی کوشش کرتیں پھر اپنے آنسو چھپا چھپا کر اسے رخصت کر دیتیں۔ اتنے عرصے میں وہ کتنی بدل سی گئی تھیں۔ پہلے سے زیادہ کم زور اور اپنی ام سے کہیں زیادہ دکھائی دیتیں۔ انہیں بھی بیٹے کی مفارقت کا صدمہ ابو سے کم نہ تھ شاید زیادہ ہی ہو مگر ابو کا رویہ! الاماں...... خدا کی پناہ! انہوں نے ایک سرد سی بے اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ دل اور نگاہ کو بیک وقت اذیت میں مبتلا کر دینے والی ا حسی جسے بس اماں بی جیسی ہی صابر بیوی برداشت کیے ہوئے تھی ورنہ کوئی مٹی ا عورت ہوتی تو چیخ اٹھتی۔ اب تو وہ رانی سے بھی خاصی حد تک غافل رہنے لگے۔ پہلے کی طرح اُس کی دلچسپیوں میں شریک ہوتے اور نہ گھمانے پھرانے لے تھے۔ ڈیوٹی کے بعد سارا دن لائبریری میں جانے کیا کچھ پڑھا کرتے۔ ایک مہم خاموشی اور بوجھل سا سناٹا در و دیوار پر چھایا رہتا۔ بوند بھرے کا دن گزرنے میں آ نہ کالی سیاہ طویل راتیں سمٹنے میں آتیں۔ عجیب وحشت زدہ دور تھا۔



رانی خوب بور ہو کر ہوسٹل آتی تو اگلے ہفتے گھر جانے کو جی نہ چاہتا۔ اُس کا ننھا ذہن اپنے اردگرد کے ماحول پر سایۂ فگن بے سکونی اور بے حسی کا نقاب اُلٹ کر ت کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھا اور کچھ بھی نہ سمجھ سکنے کی بنا پر اُلجھ اُلجھ کر رہ جاتا۔ اُس ذرا سی عقل میں یہ قصہ نہیں آتا تھا کہ ایک راجہ بھیا کے آ جانے سے گھر کے اندر اتنی بے تحاشہ رونق اور گہما گہمی کیوں سما گئی تھی اور اب چلے جانے پر قبرستان کا سا ٹا کیوں طاری ہو گیا!!

وہ کس کلاس میں تھی تب پھر ان کے گھر میں ایک ننھے منے فرد کا اضافہ ہوا مگر اس دفعہ یہ فرق تھا کہ ابو اُسے خوشی خوشی ہاسٹل سے لے کر نہیں گئے تھے' نہ ہی اُسے لے ہی کسی طرح کی اطلاع تھی بلکہ وہ خود ہی چھٹی کے دن ڈرائیور کے ہمراہ گھر آئی اور اُن کے اُس پیارے مہمان سے متعارف ہوئی۔

اُسے صرف اماں بی ہی خوش خوش اور مگن نظر آئیں۔ ابو کے چہرے پر آسودگی کا ہلکا سا نشان تک نہ ملتا تھا۔ نہ ہی انہوں نے اپنے تاثرات کا اظہار ضروری سمجھا تھا۔

اماں بی نے از خود اسے "شرمین بی بی" کہنا شروع کر دیا۔

مگر اس دفعہ رانی نے بھی حیرت انگیز طور سے کوئی توجہ نہ دی۔

دراصل راجہ بھیا کے بعد سے اُسے ہنستے کھلکھلاتے زندہ کھلونوں سے ڈر لگنے لگا تھا کہ جانے کب چپکے سے سفید سفید کپڑے پہن کر دوسروں کے ساتھ چل پڑیں اور وہ پہلے کی طرح روتی بلکتی اکیلی رہ جائے۔ بنا پیار کیے اور "ٹاٹا" کہے بغیر تو جانے کو وہ بہت بڑی بدتمیزی خیال کرتی تھی..... اُسے تو مس ڈیسوزا نے ابتداءً ہی یہ دیا تھا کہ ہر اچھے بچے کو "ہیلو" اور "بائے" کہنے کا سلیقہ اور شعور ضرور آنا چاہیے۔ چناں چہ اس نے شرمین کے ساتھ دوستی نہیں کی اور اگلے دن ضد کے بغیر ہی چلی گئی۔ گھر میں اس کا جی نہ بہلا۔

ویک اینڈ پر پھر گھر آئی۔ اُسے یہ دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ شرمیں طرح ہاتھ پاؤں مار مار کر کھیل رہی تھی۔ اسے خوش باش دیکھ کر اس کا دل مطمئن ہوا۔ پھر تو..... بہت سارے دن گزرتے گئے..... گزرتے گئے لیکن شرمین نے ایسی والی بدتمیزی نہیں کی اور نہ ہی سفید کپڑے پہن کر دوسروں کے ساتھ کہیں گئی بلکہ لحظہ بہ لحظہ ماں کے ساتھ ساتھ رہنا پسند کرتی تھی۔ اس طرح رانی بھی رفتہ رفتہ اُس سے مانوس ہوتی چلی گئی۔ دونوں کے درمیان دوستی کا ایک پیارا سا تعلق پیدا ہوتا گیا۔

جوں جوں رانی بڑی ہو رہی تھی، یہ بات شدت سے اُس کے ذہن میں چبھتی جا رہی تھی کہ ابو گھر اور گھر کے مکینوں سے بہت دور ہوتے جا رہے تھے۔ بیرونی مصروفیات اتنی بڑھ گئی تھیں کہ ہفتے وار چھٹی پر بھی وہ شاذ و نادر ہی گھر رہتے۔ وہ ہفتوں ان کی صورت کو ترستی۔ صبر شکر کے ساتھ ڈرائیور کے ہمراہ چپ چاپ ہوسٹل چلی جاتی۔

اماں بی نے گویا صبر و تحمل کی چادر اوڑھ لی تھی۔ تمام حالات پر چپ تھی۔ ان کی مسلسل خاموشیاں مزید رنگ لا رہی تھیں اور وہ دلیر ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے بیوی کی خاطر خود کو بدلا تھا نہ بیوی نے ان کی راہ اپنائی تھی۔ ہر آ

دن دونوں کے درمیان فاصلے بڑھاتے جا رہے تھے۔ بالآخر یہ مسلسل بڑھنے والا فاصلہ ایک ناقابلِ عبور خلیج کی طرح ان دونوں کے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حائل ہو گیا۔ ابو کو بڑھتی ہوئی بیٹیوں کا خیال آیا نہ اماں بی کی بےچارگی پر رحم وہ بےحد سہولت اور انتہائی بےحسی کے ساتھ وہی کر گزرے جو شاید شروع سے ہی اپنے دل و دماغ میں ٹھان چکے تھے۔ شاید درمیان کے سارے ماہ و سال وہ کسی ذہنی یا روحانی کشمکش کا شکار رہے ہوں ورنہ باقی تو سب کچھ انہوں نے بہت نارمل انداز میں کیا۔

رانی میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہو کر طویل رخصت پر گھر آئی ہوئی تھی، جب وہ دھماکا ہوا۔

اس کی موجودگی بھی غنیمت ہی تھی، ورنہ جانے اکیلی اماں بی کا کیا حال ہوتا! انہوں نے جانے کس حوصلے سے یہ المیہ برداشت کیا تھا! وہ تو ابو کی خوابگاہ میں کھڑی کھڑی بزدلوں کی طرح رونے لگی تھی۔ یوں بھی کوئی جیتے جی اپنوں سے منہ موڑتا ہے۔ جیسے زندہ ہوتے ہوئے مر گیا ہو!

اللہ ہی جانے ابو کو یہ کیا سوجھی تھی!

اُن کی نئی بیوی رانی سے بمشکل چند برس ہی بڑی ہوگی۔ بہت طرحدار، حسین اور ابو کی توقعات کے عین مطابق انہوں نے بالآخر اپنی سی کر ڈالی تھی۔ غراتے اُمنڈتے سیلاب کے آگے کون بند باندھ سکا ہے! جو ایسی بےتکی کوشش کرے خود بھی خطرے میں پڑے۔ سیلاب کا بہاؤ اُسے بھی ساتھ بہا لے جائے۔ اماں بی کے حوصلے ایک دم ٹوٹ گئے اور وہ ایسے کچے گھر کی مانند ڈھتی چلی گئیں جس کی بنیادوں سے اچانک پانی اُبل پڑا ہو۔ زندگی سے بہت بڑا دھوکا کھایا تھا انہوں نے۔

رو دھو کر رانی نے تھک کر گہرا سانس لیا۔

بہت بچپن سے اور پھر شعور کے بیدار ہوتے ہی آتی جاتی سانسوں کے درمیان

کہیں اندر ہی اندر چبھنے والا کانٹا اس سانحے سے جیسے نکل گیا تھا۔ چلو بچپن سے ہی کم[...] کے اسٹیج پر کھیلے جانے والے ڈرامے کا ڈراپ سین تو ہوا۔ جی ہر وقت کسی انجانے خدشے سے گھٹا گھٹا رہتا تھا۔ اُس جان لیوا عذاب سے جان تو چھوٹی۔ اُس نے بہت ہلکی پھلکی ہو کر یہ سب سوچا تھا۔

اماں بی پر تو شریمن پڑا اور دیکھنے سننے والوں پر جو گزری سو گزری مگر رانی تو جیسے ہی بہت پُرسکون ہو گئی تھی۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت اُس کا انٹر کا رزلٹ تھا۔

میٹرک میں محض سیکنڈ ڈویژن حاصل کرنے والی نے اس بار صوبے بھر میں سیکنڈ پوزیشن حاصل کی تھی۔ شام کے اخبار میں اس کی تصویر اور چھوٹا سا انٹرویو "مستقبل کی ڈاکٹرز" کے عنوان سے چھپا تھا۔

وہ سارا دن آنسو ضبط کر کے آنے جانے والوں سے مبارکبادیں وصول کرتی رہی۔ کئی ایک ٹیلی فون بھی آئے۔

"آہ! ایسے بے آسرا تو یتیم بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ جیسے ہم ہیں۔ پتا نہیں ایسے خوشیوں کے موقع پر اپنے وہ پیارے رشتے کیوں یاد آ جاتے ہیں، جو دراصل اپنے نہیں ہوتے۔" سارا دن مصروف رہنے کے باوجود وہ دن بھر ایسی ہی باتیں سوچتی، کڑھتی رہی۔ مگر ماں اور چھوٹی بہن کے سامنے آہ تک لبوں پر نہ آنے دی۔ اشکوں کی برسات اندر ہی اندر اتارتی رہی۔

شام گہری پڑ چکی تھی۔ ہر طرف برقی قمقمے جگمگا اُٹھے تھے۔ تب اچانک ہی ابو کا فون آ گیا۔

دوسری طرف اُن کی نرم نرم دل کی گہرائیوں کو چھو جانے والی ساحر آواز اُسے ایک دم اَپ سیٹ کر گئی۔

"ہیلو۔۔۔ ابو۔۔۔ جی ہاں۔ میں ہی ہوں۔۔۔ رانی" باوجود ضبط کے اُس

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

لہجہ بھیگ گیا۔

لاشعوری طور پر وہ تو کل سے اس ایک فون، اس ایک شفیق دلآویز آواز کی منتظر تھی۔

باپ بیٹی کا رشتہ بھی دنیا کا کتنا سچا اور مقدس رشتہ ہے۔

اگر وہ سامنے ہوتے تو شاید آج وہ ان کی ساری زیادتیاں اور ستم نظر انداز کر کے ان کے پُرشفقت سینے سے لپٹ کر اپنی ساری محرومیاں اور جنم جنم کی تشنگیاں مٹا ڈالتی۔

وہ اوپر اوپر سے ہنسنے مسکرانے والی زخم خوردہ خوددار لڑکی، جس کا پورا وجود شفقت پدری کے لیے لمحہ لمحہ ایک ایک پل تڑپا تھا اور تڑپ تڑپ کر زندہ تھا۔

آہ! یہ خوددار لوگ...... جو بہت اندر روحوں میں پلنے والے غم، دلوں میں ہر وقت کھٹکنے والے دکھ، احساسات کی ستم گر چبھن اور ظالم حافظے کی زندہ درگور کر دینے والی بھولی بسری یادوں کو پوری کائنات سے پوشیدہ رکھ کر دل کے کسی ویران، سنسان گوشے میں چھپا کر رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ ان کے زخم مندمل ہو گئے ہیں۔ انہیں کسی کی یاد نہیں ستا سکتی، انہیں کوئی خیال نہیں رلا سکتا اور تب! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فقط ایک ہی جھونکا ساری خوش گمانیوں کو لے اُڑتا ہے۔ سارا ساماں، اپنی ذات پر چھایا ہوا سارا بھرم سا ذرہ ذرہ ہو کر بکھر جاتا ہے اور پھر سوچنا پڑتا ہے۔

"یا مالک! تو نے ہمیں اتنا کمزور اور بزدل کیوں بنا ڈالا؟"

ابو جیسے بہت قریب ہو کر بڑے دلار سے کہہ رہے تھے۔ "رانی بیٹے! آپ نے اتنی شاندار اور عظیم کامیابی حاصل کی ہے جس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ گڈ...... ویری گڈ بیٹے آپ نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا۔ آپ نے میری بہت بڑی اور اہم ترین خواہش پوری کی ہے۔ مجھے کتنا شوق تھا آپ کو ڈاکٹر دیکھنے کا! آپ کو اب یقیناً

میڈیکل جوائن کرنا ہے۔ یہ بتائیے آپ کو کیا تحفہ چاہیے انعام میں اپنے ابو سے؟"
وہ اتنے یقین اور بھرپور اعتماد کے ساتھ یہ باتیں کر رہے تھے کہ لمحہ بھر کو را[نی] لڑکھڑا سی گئی۔ وہ بہت حوصلے سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ خوب جانتی تھی کہ باپ اُس سے کس قدر محبت رکھتے ہیں۔ اُسے ڈاکٹر دیکھنے کی دیرینہ تمنا تھی ان کو!

لمحہ بھر کے وقفے میں اس کا ذہن قلابازیاں کھاتا ہوا کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ بچپن سے اب تک کے واقعات متحرک فلم کی مانند نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے۔

اماں بی کا سفید دوپٹے کے ہالے میں جو کھلا مسکراہٹ والا چہرہ اور سونی کلائیاں جیسے اس کے سامنے لہرا لہرا کر انصاف کا تقاضا کرنے لگیں۔

دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ شاید فیصلے کی گھڑی آن پہنچی۔ کسی نے اس کی سماعت میں سرگوشی کی۔ پل کے پل منتشر دماغ نے سوچا۔ ہائے یہ مردوں کی خود غرض مطلب پرست فطرت! ہر دفعہ ہر جگہ اپنی ہی خواہشات اور آرزوؤں کو مقدم رکھنے والی قوم!! کہیں بیوی پر حکم چلاتے نظر آتے ہیں تو کبھی اولاد کو سرنگوں کر کے خوش ہوتے ہیں۔ کتنے بے شمار روپ اور کتنے سارے چہرے ہوتے ہیں فقط ایک مرد کے.....!

ایک طرف محبوبہ سے کہتا ہے۔ "میں غیر شادی شدہ ہوں ابھی تو مجھے اپنی پسند کی شادی رچانی ہے۔"

دوسری طرف بیوی کو یقین دہانی کراتا رہتا ہے کہ "تم میری زندگی میں شامل ہونے والی پہلی اور آخری عورت ہو۔"

"رانی کے دل و دماغ کے دریچوں سے ایک شدید نوعیت کا طوفان ٹکرا کر گزر چکا تو وہ اپنی زندگی بھر کا نازک اور اہم ترین فیصلہ کر چکی تھی۔ ایسا فیصلہ جو ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ اُس نے اپنی دلی خواہش اور ذاتی تمنا کو مٹا کر اپنی ساری محنت اور دماغی کاوش کو خاک میں ملا کر صرف ابو کے غرور کو شکست دینے کی خاطر وہ فیصلہ کیا تھا جس کا انجام

کرتے وقت اس کی روح تک کانپ اٹھی تھی۔

سینے میں درد کی اتنی زبردست اور شدید لہر اٹھی کہ وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی مگر کیا مجال ہے کہ لہجے اور آواز میں لرزش پیدا ہوئی ہو! وہ پتھر کی طرح ٹھوس اور بے لچک لہجے میں بولی۔ "افسوس ابو کہ میں آپ کی یہ اہم ترین خواہش پوری نہیں کر سکتی..... مجھے میڈیکل جوائن کرنے کا قطعی شوق نہیں ہے۔ میں اب تعلیم کا سلسلہ ختم کر رہی ہوں..... مجھے ڈاکٹر کے بجائے ایک معمولی ٹیچر بننا زیادہ پسند ہے..... اور..... اور..... میں خود کو آپ کے قیمتی تحائف کے لائق بھی نہیں سمجھتی..... اچھا..... خدا حافظ۔"

پھر تو ٹیلی فون کالز کا گویا تانتا بندھ گیا۔

دن دیکھا جاتا نہ رات۔ دوپہر کا سے ہوتا یا سویرے سویرے۔ ابو کو کسی پل چین نہ تھا۔ وہ برابر فون پر فون کرتے۔ رانی کو سمجھا سمجھا کر عاجز ہو گئے مگر وہ اپنے فیصلے پر چٹان کی مانند ڈٹی رہی۔ اُسے کوئی موقف اپنی زبان سے نکلی ہوئی بات سے منحرف نہ کر سکا۔ وہ ان کو شکست دینے پر تلی بیٹھی تھی۔

ابو کی پریشانی حد سے سوا ہو گئی۔

اُدھر میڈیکل انٹرویو کی تاریخ نکل جا رہی تھی۔ ادھر لڑکی ہتھے سے اکھڑی جا رہی تھی۔

اُن کی سمجھ میں یہی سبب آ سکا کہ لڑکی کو ماں ان کے خلاف ورغلا رہی ہے۔ بس پھر کیا تھا! اُن کے عتاب کو آواز دینے کے لیے یہ تصور ہی کافی تھا۔ اماں بی کی بھلا اُن کے سامنے کیا حیثیت تھی۔ ایک روز پکار بیٹھے ان کو فون پر۔ پھر تو وہ سنائی ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ ان بے چاری کو بے نقط صلواتیں سنا ڈالیں..... دھمکیاں..... پھٹکار..... ڈانٹ..... اُن سے جواب تک نہ بن پڑا۔

جب جی بھر کے دل کی بھڑاس نکال چکے تو بیٹی کو فون پر بلایا اور تمہید کے بغیر دوسرا حکم لگا دیا۔

"بیٹے! مجھے تمہاری ہر خواہش عزیز ہے۔ تم جیتیں اور میں ہارا..... مت میڈیکل لائن جوائن کرو مگر ــــ تمہیں سروس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ بس تم کل صبح تیار رہنا۔ وہاں اب تمہیں ایک دن بھی نہیں رہنا ہے۔ میں خود تمہیں لینے آؤں گا۔ تمہاری والدہ کے کن بہلاوے کو شرمین کافی ہے۔ تم اب میرے پاس رہو گی۔ یہیں پڑھنا۔ جو سبجیکٹ چاہنا' لے کر فارن چلی جانا' میں تمہاری ہیلپ کروں گا۔ سویرے تیار رہنا او کے؟"

رانی ان کی بات پوری طرح سمجھ بھی نہ پائی تھی کہ کھٹ سے فون بند ہو گیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔

پوری رات شدید قسم کی کشمکش میں بیتی۔

اماں بی کو ابو کا یہ نیا حکم سنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ان کی آخری صورت اور سہما سہما انداز اس نئے ستم سے آگاہی کی چغلی کھا رہا تھا۔ اُس کو بار دیکھتی تھیں اور نظریں ہٹا لیتی تھیں۔ کچھ کہنے کو ہوتیں' کہتے کہتے رُک جاتیں۔

شرمین ہر بات سے بے خبر پڑی سو رہی تھی مگر یہ دو ماں بیٹی اپنے اپنے مقام پر ایک ہی سوچ اور ایک ہی خوف سے لرزتی رہیں۔ ایک دوسرے سے کچھ کہہ سن لیتیں تو دل کی بھڑاس نکل جاتی۔ شاید جلتے سلگتے احساسات کی تڑپ میں کمی آ جاتی لیکن وہ تو ایک دوسرے سے چھپ چھپ کر جاگتی رہیں۔ جاگ جاگ کر سسکتی رہیں۔ بستر پر تو جیسے کانٹوں کی فصل اُگ آئی تھی۔ کسی کروٹ قرار نہ تھا۔ کسی پہلو چین نہ تھا۔ ایسی رات' جس کا ہر لمحہ کرب میں ڈوبا ہوا تھا۔ سینے میں اشکوں کی بارات اتری ہوئی تھی مگر آنکھوں کی دہلیز پار کرنے پر پابندی تھی۔

باہر چاند کے بغیر رات آہیں بھر رہی تھی اندر رانی اور اماں بی سسک رہی تھیں۔ امید کی ایک کرن بھی نہ تھی جو مایوسی کے گھور اندھیروں کا دیا بن جاتی۔ زندگی ایک بار پھر تمام تر قہر کے ساتھ چولا بدل کر راہ میں آن کھڑی ہوئی۔ وہ بار بار سوچتی۔

زندگی یوں تو ہمیشہ سے پریشان سی تھی
اب تو ہر سانس گراں بار ہوئی جاتی ہے!

آتی جاتی سانسیں الزام لگ رہی تھیں۔ زندگی نہ ہوئی اک تماشہ ہو گئی۔

اُس نے جھنجلا کر سوچا۔ "اِن ابو صاحب نے تو زندگی اجیرن کر دی...... دراصل...... انھیں اماں سے کوئی دلی عداوت ہے۔ کوئی ایسی دشمنی ہے جس کی چڑ ہی چڑ میں وہ ہر معاملے میں انتہائی اقدام کر کے اپنی رُوح کو خوش کرتے رہتے ہیں...... یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اُن کا کیا قصور ہے؟ اُن کا سب سے بڑا جرم یہی ہے نا کہ وہ ایک مجبور اور لاچار ماں ہیں اور وہ ان کے خلاف کسی بھی طرح کی کارروائی نہ کرتی تھیں...... اُن کی مسلسل خاموشی اور چپ نے ابو کو شیر بنا دیا تھا۔ حق دار جب خود ہی اپنے حق سے دستبردار ہوتے پر تُل جائے تو ظاہر ہے اُس کی جھولی میں ہار کے سوا اور کیا آ سکتا ہے؟ یہی معاملہ یہاں بھی ہے......"

غم و غصے کی تیز لہر نے رانی کو چاروں طرف سے بُری طرح جکڑ رکھا تھا۔ تب بہت بیزار ہو کر بڑبڑائی۔

"ٹھیک ہے...... وقت پر میری کھوپڑی میں جو سمائی وہی کر گزروں گی۔" سویرے رانی بیدار ہوئی تو اماں بی نماز اور تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد اُس کی چیزیں اُٹھا اُٹھا کر ایک بڑے سے اٹیچی میں ڈالتی جا رہی تھیں اور آنکھیں پونچھتی جا رہی تھیں۔

اُس کی نگاہوں میں بے اختیار بچپن کا وہ مٹا مٹا سا لیکن ایک ناقابلِ فراموش دھندلا سا واقعہ گھوم گیا جب اُسے کانوینٹ کے ہوسٹل میں بھیجا جا رہا تھا۔

ساتھ ہی وہ عالم تاک رات بھی یاد آ گئی جب اُس نے ابو کا تھپڑ اور اماں بی کا رخسار دیکھا تھا۔ جو آج تک ذہن کے کسی محفوظ گوشے میں دبا پڑا تھا اور اس وقت بالکل تازہ تازہ لگ رہا تھا۔

منظر آج بھی اُسی صبح والا تھا مگر..... آج کے اور اُس وقت کے حالات میں فرق تھا۔ اُس رات وہ بے جان تکیے سے خوف زدہ ہو کر چمٹ گئی تھی۔ خوف کے مارے آنسو خشک ہو گئے تھے۔

مگر..... آج..... خوف کے بجائے کسی اندرونی غم و غصے سے آنسو خشک تھے۔

ثمرین کو کچھ بتائے بغیر اماں بی نے ناشتہ کرایا اور تیار کر کے اسکول بھیج دیا۔ رانی سے کوئی بات نہیں کی۔ ڈرائنگ روم کے دیوان پر چپ چاپ لیٹ گئیں اور دوپٹے کے آنچل سے منہ ڈھانپ لیا۔ ناشتہ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی نہ کیا تھا۔

قالین پر اُس کے مختلف سامان سے بھرے ہوئے چار عدد اٹیچی کیس تیار رکھے تھے اور وہ..... زرد چہرہ اور سوجی سوجی آنکھوں کے ساتھ کھڑکی میں کھڑی سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"رانی چندا! لباس تبدیل کر لو۔ تمہارے ابو آنے والے ہیں۔" اماں بی نے بھرائی ہوئی آواز میں یاد دہانی کرائی۔

"بس..... یوں ہی ٹھیک ہے اماں۔" اُس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

سلور کلر کی نیو کرولا کار کے موڑ مڑتے ہی رانی کھڑکی سے ہٹ گئی۔ یہ گاڑی اور اس میں بیٹھنے والوں کو وہ متعدد بار شہر میں دیکھ چکی تھی اور خوب پہچانتی تھی۔

لمحوں کے وقفے سے قدموں کی آہٹ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی اور ابو آہستگی سے پردہ اُٹھا کر اندر چلے آئے۔

اماں بی دھیرے سے اُٹھ بیٹھیں مگر وہ انہیں یکسر نظر انداز کرتے ہوئے رانی کی

طرف بڑھے۔ ایک ہاتھ بڑھا کر اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا۔ شاید خود کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ ضبط کی کوشش میں اُسے آہستہ آہستہ تھپک رہے تھے۔

شفقت پدری کی انمول خوشبو اور پاکیزہ لمس کو محسوس کرتے کرتے رانی ضبط کی جانے کن منزلوں سے گزر گئی۔

شدید جذب کے عالم میں وہ صدیوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کرتی ہوئی اُس شفیق شانے سے علیحدہ ہوئی اور آہستہ قدموں سے دور ہٹتی چلی گئی۔ اماں بی کا اداس اور اجاڑ سراپا پھر باپ بیٹی کے درمیان حائل ہو گیا لیکن وہ بلا تمہید بولے۔ "بیٹے! میرے لیے مزید رکنا ممکن نہیں۔ بس اب نکل چلو۔"

قریب قریب پڑے ہوئے چار اٹیچی دیکھ کر انہیں دلی خوشی ہوئی تھی اور سمجھ گئے تھے کہ وہ ان کے حکم کے مطابق پوری تیاری سے بیٹھی ہے۔ رانی نے کوئی جواب دیئے بغیر خشک آنکھوں سے جی بھر کر اُن کو دیکھا اور کئی لمحے دیکھتی رہی۔

گزرتے ماہ و سال نے کوئی نشان بھی تو نہ چھوڑا تھا اُن کے سراپے پر..... وہی سرخ و سپید رنگ اور صحت و شادمانی کے پیکر میں ڈھلا ہوا وجود بلکہ پہلے سے کئی گنا زیادہ ہی اسمارٹ اور آسودہ آسودہ سے لگ رہے تھے۔ شاید خوب صورت اور جوان ہم سفر کی ہم راہی ان کو سدا بہار بنا گئی تھی۔

رانی کی نگاہیں بے ساختہ اماں بی کے ناکردہ گناہ کے احساس سے جھکے ہوئے سر کی طرف اُٹھ گئیں۔

اُن کے سراپے میں مدتوں سے رچی بسی خزاں آلودہ افسردگی زرد رو رخسار اور ہونٹوں پر لگی چپ کی مہر..... وہ تڑپ کر رہ گئی۔

ایک ساتھ زندگی کے سفر کا آغاز کرنے والے دو افراد کے درمیان نظر آنے والا واضح تضاد محسوس کر کے اُس کا دل و دماغ ابو کے خلاف شکایات سے لب ریز ہو گیا۔

رات سے چلتے جھلتے جذبات پر بے پناہ غم و غصہ ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ اُس ایک شخص کے ناروا سلوک نے اُس کی ماں کو اجاڑ رکھا تھا۔ اُسے اپنا وجود بے حد تند آندھیوں کی زد پر آجانے والے ایک بے بس اور مجبور دیے کی مانند لگ رہا تھا۔

"بیٹے! سنا نہیں آپ نے؟" ابو نے بڑی ملائمت اور شفقت سے اُس کے گال تھپتھپائے۔

رانی کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ وہ ایک شدید قسم کے جھٹکے سے بیدار ہو گئی اور تڑپ سے چیخی۔ "نہیں ابو...... میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی...... کسی قیمت پر نہیں۔ میں آپ کو پسند نہیں کرتی...... آپ میرے ابو نہیں ہیں۔"

ابو دھیرے سے ہنس پڑے۔ "ارے بیٹا! ہمیں بے وقوف بنایا جا رہا ہے...... بھی دن دھاڑے...... ایں!" انہوں نے چاروں اٹیچیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "سامان تو سارا تیار رکھا ہے آپ کا!"

رانی نے بمشکل اپنے بے قابو سانس اور کانپتے ہاتھ پیروں کو کنٹرول میں کیا اور بہت تحمل سے بولی۔ "جی ہاں...... بے شک سب سامان تیار ہے اور آپ بہ خوشی جا بھی سکتے ہیں۔ یہ چاروں سوٹ کیس آپ کی عنایت کردہ چیزوں سے بھرے ہوئے ہیں لیکن آئندہ ہمیں آپ کی ایک پائی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہم نے صبر کر جان لیا ہے۔ میں اب ملازمت کر کے اپنی والدہ اور بہن کا پیٹ پال سکتی ہوں۔ آپ اپنی دنیا میں واپس چلے جائیے۔ ہمارے اور آپ کے راستے یقیناً الگ الگ ہیں۔ ہم نے اکیلے رہنا سیکھ لیا ہے۔ تنہائیاں کسی کو کھا نہیں لیتیں۔ دیکھ لیا نا آپ نے! ہم تنہا ہی زندہ ہیں نا! کیوں کہ ابھی آپ کو ہماری ضرورت نہیں ہے تو ہم بھی...... آپ کی ذات سے بے نیاز ہیں۔ مجھے خیرات کے طور پر ملنے والے عیش و آرام کی قطعی ضرورت نہیں۔ اب میرا مقصد حیات میری والدہ اور میری چھوٹی بہن ہیں۔ میں نے

تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم وہ حاصل کرتے ہیں جن کے باپ...... زندہ ہوتے ہیں...... ہم تو بہت پہلے ہی یتیم ہو چکے ہیں!"

ابو دنگ رہ گئے۔ حیرت اور دکھ کی زیادتی سے سُن ہو گئے۔

بیٹی کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھے ہوئے تیر کی مانند دل پر جا بجا کر لگا۔ اُس نے نشانہ بھی تو ٹھیک لیا تھا۔

وہ درد سے نڈھال تلملا کر چلائے۔ "یہ کیا اول فول بک رہی ہو! ہوش میں نہیں ہو کیا؟" لیکن آج تو رانی سچ مچ بے قابو ہو چکی تھی۔ ہوش و خرد سے بیگانی۔ دل کی دیواروں سے ٹکراتا ہوا گرم گرم لاوا ایک ہی جھٹکے سے بہہ نکلا۔ پھوٹ پھوٹ کر بہنے لگا۔

اس وقت اُس پر وہ جنونی کیفیت طاری تھی، جس میں ڈوب کر حجاب اور ادب و لحاظ کے تمام پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ مظلومیت سراپا فریاد بن کر اٹھتی ہے اور راہ میں حائل ہر رکاوٹ اور بندش کو توڑ کر سراپا غضب میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ان لمحات میں وہ اپنے آپے میں کب تھی! اسی کیفیت میں بولی۔ "جو کچھ آپ نے سنا وہ ایک تلخ حقیقت ہے ابو! یہ سارے رشتے ناطے آپ نے خود توڑے ہیں...... خود منقطع کیے ہیں۔ کسی دوسرے کا دخل نہیں ہے اس میں۔"

ابو کی ذہنی رو ایک دم بھٹک گئی وہ اماں بی کی طرف دیکھ کر غرائے۔ "یہ سب تمہاری چار سو بیسی ہے قیصر جہاں...... میں خوب اچھے طریقے سے سمجھ رہا ہوں تمہاری کارستانی اور......"

"ابو!......" رانی دونوں کے درمیان آن کھڑی ہوئی۔ "اماں بی پر کوئی الزام لگانے سے قبل سوچ لیجیے کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں! ایسی بے جا جانبداری کا آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ میں اب باشعور اور سمجھدار ہوں۔ اپنے لیے جہاں مناسب سمجھوں گی رہوں گی۔ قانوناً بھی اپنی مرضی کی مالک و مختار ہوں۔ ہم پر آپ کی اجارہ

داری اب ختم ہوئی۔ وہ وقت گیا جب آپ اماں بی پر ہر قسم کا ستم روا رکھتے تھے۔ آج سے ہمارے آپ کے رہے سہے رابطے بھی ختم ہوئے۔ آپ کا مجھ پر اور میرا آپ پر کوئی حق نہیں...... آپ جا سکتے ہیں، سارے رشتے، سارے تعلق توڑ کر...... دراصل! آپ خود بھی یہی چاہتے ہیں!"

اماں بی لرزتے جسم اور کانپتے قدموں سے آگے بڑھیں اور ایک زوردار چانٹا اس کے گال پر جڑ دیا۔

"بدتہذیب...... بدزبان...... بے حیا!!" الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اُن کی زبان سے ادا ہوئے۔ پھر وہ بُری طرح ہانپتی ہوئی وہیں قالین پر بیٹھ گئیں۔

ابو سناٹے میں آ گئے۔

زندگی میں پہلی بار وہ اتنے بدحواس ہوئے کہ سگار ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ چہرے پر زردی سی آ گئی۔ پھر...... روتی ہوئی رانی پر ایک نگاہ ڈالی، سگار اُٹھایا اور ڈگمگاتے قدموں سے باہر نکلتے چلے گئے۔

رانی نے روتے روتے نیچے جھک کر اماں بی کو بانہوں کے حصار میں بھر لیا اور بلک بلک کر کہنے لگی "اماں بی...... میری اماں بی! میں نے ابو کو چھوڑ دیا۔ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا...... وہ میرے کچھ نہیں لگتے۔ میں آپ سے جدا نہیں ہو سکتی۔ میری زندگی تو آپ اور شرمین ہیں۔ باقی میں کسی کو نہیں جانتی۔ ابو پتھر دل اور بے حس ہیں۔ آپ مجھ سے خفا نہ ہوں...... ورنہ میری زندگی میں کیا باقی بچے گا! جتنا جی چاہے، مار لیجئے...... مار مار کر میرا دم نکال دیجئے لیکن...... مجھ سے روٹھئے مت۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ آپ کی خفگی برداشت کر سکوں۔ وہ خفا ہو گئے انہیں خفا رہنے دیں، ہم سے خوش ہی کب تھے؟"

دونوں ایک دوسرے سے چمٹی زار و قطار رو رہی تھیں۔ خبر نہیں بچھڑ کر مل گئی تھیں یا بچھڑ کر ملی تھیں!!



آہستہ آہستہ زمانے کے سرد و گرم میں چار سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ وقت نے کئی کروٹیں بدل لی تھیں۔

رانی کبھی چار برس پہلے کے واقعات سلسلے وار یاد کرتی تو اسے اپنے حوصلے اور بے پناہ جراتوں پر تعجب ہوتا تھا۔ اُس نے کس پامردی اور مستقل مزاجی کے ساتھ ماہ و سال پر محیط صبر آزما مدت کاٹی تھی، یوں جیسے کوئی پل پل سانس کی راہ خنجر اُتار رہا ہو۔ اس دل کی رگ رگ سے لہو کی رِستی ہوئی بوندوں نے اُس کی خودداری کو مجروح کیا تھا۔ اس نے لمحے لمحے کی موت کے بعد بنس بنس کر جینا سیکھا تھا اور اس آزمائش میں کامیاب بھی تھی۔

اپنے دکھوں پر دل نواز مسکراہٹوں کے پردے ڈالنا تو جی بھر کر رو لینے سے زیادہ مشکل اور جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔ اُس کے مختصر سے نازک، کومل اور کم زور سے وجود پر ابو کی ضد اور اماں بی کی مستقل مزاجی ختم تھی۔ درحقیقت وہ دو متضاد شخصیتوں کا مرکب تھی۔ مستقل مزاج اور نرم خو تھی تو ساتھ ہی ضد کی پکی اور اپنی زبان کی کھری بھی تھی۔

اماں بی کی زندگی سے اُس نے بہت بڑی نصیحت لی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ

اس دنیا میں خاموش اور چپ چاپ افراد کا گزر ممکن نہیں اس لیے اپنے دکھوں اور مصائب پر کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع ہی کیوں دیا جائے۔

کھوکھلے لوگوں کو اداس اور غمگین چہروں کا مذاق اڑانے کے سوا کچھ نہیں آ ہنسی خوشی وقت گزارنا بھی تو ایک سحر ہے اس لیے وہ زندگی کے آخری موڑ تک ذات کو اس سحر میں گم رکھنا چاہتی تھی۔ تا کہ کوئی اس پر اُس کی والدہ اور بہن پر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ اُس نے بہت کم سنی میں زندگی سے جو چوٹ کھائی تھی زندگی کو بہت قریب سے دیکھ اور پرکھ لیا تھا۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے اور ایسی نادر تو شاذ ہی کہیں دیکھنے کو ملتی ہے جب ایسے تلخ تجربے کے بعد کوئی کانٹوں میں جانے کے بجائے پھولوں اور کلیوں سے لدا پھندا اور خوشبو بانٹتا ہو!

اُس روز کے واضح جواب کے بعد ابو نے لوٹ کر اُسے لے جانے کی کوشش کی۔

یوں بھی وہ اپنی نئی زندگی کی دلچسپیوں اور رنگینیوں میں ڈوبے ہوئے تھے کچھ اماں بی سے جو انہیں ہمیشہ کی ایک دلی کدورت اور عداوت سی تھی اسی کے کو لینے آن پہنچے تھے ورنہ خدا نے انہیں نئی بیگم سے تین بہت پیارے بیٹوں سے تھا اور وہ اپنی دل پسند دنیا میں مگن ہو گئے تھے لیکن اپنے فرض سے خوب آگاہ رانی کے اکاؤنٹ میں ایک معقول رقم اس کے تعلیمی اخراجات کے لیے اُسی نے میں جمع کروا دی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ماہانہ رقم کا منی آرڈر گھر کے پتے پر تھا۔

پہلے پہل رانی نے بہت شور مچایا تاں تاں کی تیجی چلائی۔ باپ کے سا ہوتے دعوتی کا پاس تھا اُسے اس لیے اُن کے دیے اخراجات سے انکار کر مگر اس موقع پر اس نے اُن کی ایک نہ سنی اور ایک بہترین ساتھی اور

یا کی طرح سمجھانے لگیں۔

"چندا—میری لعل—زندگی سمجھو—یوں ہی اوپر اوپر سے دیکھ کر مت رو۔ یہ دنیا بہت ستم گر اور ظالم چیز ہے۔ یہاں کسی کہتے کی زبان نہیں پکڑی جا تی۔ بات کا بتنگڑ بنتے دیر نہیں لگا کرتی۔"

"آپ یوں ہی دنیا سے ڈر ڈر کر زندہ رہیے۔" وہ جل کر چلائی۔ "آپ کے یسے ہی خدشوں نے اور خاموشیوں نے ابو کو اتنا نڈر اور بے حس کر دیا کہ وہ دوسری ادی....."

اماں بی نے بے قرار ہو کر اس کی بات کاٹ دی۔ "انہوں نے میری اجازت لے کر دوسری شادی کی ہے اور یہ کچھ ایسی انہونی بات بھی نہیں۔ دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے۔"

رانی نے آنکھیں پھاڑ کر اُن کو دیکھا۔

"یعنی! آپ نے خود ابو سے کہا کہ دوسری شادی کر لیں۔"

"ہاں—میں نے انہیں اجازت دی تھی۔" اماں نے صاف الفاظ میں جواب ا۔ "اسی لیے انہوں نے مجھے طلاق نہیں دی۔ کم سے کم اُن کا نام تو ہے میرے لیے ان نام پر بیٹھے زندگی بیت جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ بعض اوقات زندگی معلوم نہیں سان سے کیسا کیسا خراج وصول کرتی ہے میری جان! اور وقت کی مجبوریوں میں ے کو بھی کچھ تو قبول کرنا پڑتا ہے۔ خدا کی خدائی سے باہر تو نہیں نکلا جا سکتا! ان ہمیشہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے جیتا ہے بعض دفعہ اپنے ساتھ وابستہ کئی دوسری وم زندگیوں کا سوال بھی درمیان میں آ جایا کرتا ہے اور تب..... انسان کو وہی کچھ نا پڑتا ہے جس میں سب کی سلامتی اور امن مضمر ہو۔ تم بچی ہو۔ ابھی ان باتوں کو سمجھ سکتیں۔ بس یہ جان لو کہ تم دونوں اُن کی اولاد ہو اور اپنے اخراجات باپ سے

لینا کسی شرم و بے غیرتی کا موجب نہیں کہلا سکتا۔ یہ تمہارا حق اور ان کا فرض ہے جو اور قانوناً دونوں طرح جائز ہے۔"

رانی نے پہلی مرتبہ اماں بی کو اتنی ساری اور گہری باتیں کرتے سنا تھا مگر اس حیرت جوں کی توں برقرار تھی۔

"لیکن اماں! آپ کو خوب یاد ہوگا میں نے اس روز ابو سے کیسی باغیانہ باتیں کی تھیں اور ان کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ آئندہ ہمیں ان کی اعانت و کفالت ضرورت نہیں ہے۔"

اماں نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ "مجھے سب یاد ہے اور وہ سب کی سب نادانی کی باتیں تھیں۔ ایسی بچگانہ باتوں کو کون سمجھ دار تسلیم کرے گا! انہوں نے شادی کر لی ہم سے علیحدگی اختیار کر لی' تاہم رہیں گے تو تمہارے باپ ہی۔ فرض تم اپنی خودداریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی رقم لوٹا کر معمولی سی کوئی سروس کر جب کہ ابھی تم تعلیمی' ذہنی اور عمر کے لحاظ سے بھی کسی سروس کے قابل بھی نہیں ہو تو صورت میں تم پر لوگ انگلیاں اٹھائیں گے کہ نہ جانے کس خرابی کی بنا پر منصور صاحب نے بیوی بچوں سے اس حد تک علیحدہ اختیار کر لی کہ ان کا حق تک نہیں دیتے۔"

"لیکن امی......" رانی نے احتجاج کیا۔

"میں نے ابھی کہا نا بیٹا کہ کہتے کی زبان کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ تمہاری بے جا جیسے تم پر بہت بڑی ذمہ داری آن پڑی ہے۔ اول تو میں کہتی ہوں کہ تمہیں ان کی بات مان لینی چاہیے تھی ورنہ اب جو کرنا ہے بہت سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔"

رانی نے پھر بھی بھرپور احتجاج کیا تھا۔

"اماں بی! یہ خیال آپ اپنے ذہن سے نکال ڈالیے۔ میں نے ابو کے سامنے جا کر غلطی نہیں کی ہے۔ بلکہ یہ میری دانش مندی تھی۔ مجھے تو اب ان سے اور

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

ساری صنف سے ہی چڑ ہو چکی ہے۔ ابو کے رویے نے کم از کم مجھے تو یہی باور کرا دیا ہے کہ مردوں کی ذات ہر روپ میں بے اعتبار ہوتی ہے۔ خود غرض...... مطلبی اور مفاد پرست ـــــ اب آپ خود غور کیجیے اگر آپ کے اور ان کے خیالات میں فرق تھا ہی تو کیا وہ اپنی اولاد اور گھر کے سکون کی خاطر خود کو بدل نہ سکتے تھے؟ کیا اتنی سی بات ان کے اختیار میں نہ تھی؟ بس آپ میرے سامنے ان کی وکالت مت کیا کیجیے۔"

"نہیں چندا! ایسی خراب خراب باتیں نہیں سوچا کرتے۔" اماں بی نے اشک آلود آنکھیں رگڑ کر کہا" کچھ بھی ہو بالآخر وہ تمہارے باپ ہی ہیں۔ جس کا مرتبہ اس قدرت والے نے ہی بہت بلند رکھا ہے۔ انصاف کیا جائے تو خرابی فقط انہی میں نہ تھی بلکہ مجھ میں زیادہ تھی۔ خطا کار در اصل میں تھی۔ میرے فرسودہ اور زنگ آلود پرانے خیالات تھے۔ اگر ان کو اپنی بے باک اور آزاد فطرت عزیز تھی تو میں ہی خود کو تبدیل کر لیتی!"

وہ بہت دیر ایک تاسف کے عالم میں گردن ڈالے بیٹھی رہیں جیسے افسوس کے ساتھ ساتھ بے بسی نے جکڑ رکھا ہو! رانی نے انہیں ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔ جی میں آئی جو کچھ کہہ رہی ہیں اماں آج چپ چاپ سن لینا چاہیے شاید یہ مدتوں کا طاری جمود ٹوٹے تو اندر کے خول سے خوش و خرم اور ہر وقت ہنستی مسکراتی ماں برآمد ہو۔

کافی دیر بعد انہوں نے ایک دبی دبی سی آہ بھر کر اسے بغور دیکھا۔ پھر مایوسی اور بے بسی سے رک رک کر بولیں لیکن...... بچی! میرے لیے ایسا ممکن نہ تھا۔ اس زمانے میں بھی میں نے دنوں اس نکتے پر غور کیا۔ اپنے آپ کو تبدیل کر لینے پر دن رات راضی کیا مگر اس امر پر قادر نہ ہو سکی۔ دنیا میں کون ایسی بدنصیب عورت ہوگی جو اپنے ہاتھوں اپنے نشیمن کو آگ لگائے گی! جب مجھے نظر آ رہا تھا کہ میرے شوہر کن خیالات کے مالک ہیں تو پھر میں خود کیوں نہ ان کے قالب میں ڈھل گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ

مجھے ان کی راہ سے ہٹ جانا زیادہ آسان لگا۔ بہ نسبت ان کے ہمراہ چلنے کے۔ دراصل آسان لفظوں میں یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ ہماری شادی ایک بے جوڑ شادی تھی۔ لہٰذا بے جوڑ شادیوں کا جو حشر ہمارے معاشرے میں ہوا کرتا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ بھی ہو گیا۔ میرے اور ان کے درمیان طبقاتی لحاظ سے بھی زمین اور آسمان کا فرق حائل تھا۔ ایسا تضاد ہماری سوچوں اور دیگر خیالات میں بھی تھا' جو رفتہ رفتہ سامنے آیا۔" اماں لمحہ بھر کو رکیں پھر گویا ہوئیں۔" وہ تھے تو ہمارے عزیزوں میں سے ہی مگر وہ بہت امیر کبیر کنبے میں پیدا ہوئے تھے اور میں بہت غریب گھرانے میں۔ ایسا فرق بھی بسا اوقات بہت بڑی تبدیلیوں کا باعث بنتا ہے۔ تم کہو گی کہ اگر ایسا تھا پھر یہ شادی ہوئی ہی کیوں کر! لیکن شاید اسی کو تقدیر کا لکھا کہا جاتا ہے۔ اُن کے والدین بہت ہی نیک دل اور پرانے خیالات کے مالک تھے۔ ہمارے ہاں ان کی والدہ کا کافی آنا جانا تھا۔ پہلے پہل ان ہی کو میں پسند بھی آئی۔ انہوں نے اپنی نیک فطرت کے طفیل بہت بچپن سے مجھے اپنی نظر التفات سے نوازا۔ ہر کام' ہر بات میں فوقیت اور اولیت دیتی تھیں۔ کچھ ایسی خوبی تھی ان کی فطرت میں کہ بڑائی چھوٹائی کی قائل ہی نہ تھیں۔ میری شکل صورت اور سیرت کے گن گاتے نہ تھکتیں۔ تمہارے دادا بھی تقریباً انہیں کے ہم خیال ہم نوا تھے۔ ان کی اولاد بھی ایسی فرماں بردار اور سعادت مند کہ والدین کی مرضی اور خوشی کے آگے دم نہ مارا اور یوں میں ان کی بہو بن گئی۔ انہوں نے ایک پل کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ اُن کے آرمی آفیسر' اونچے اسٹیٹس والے آزاد خیال بیٹے اور مجھ جیسی گھٹے گھٹے سہمے اور سمٹے سمٹے ماحول کی پروردہ لڑکی کے درمیان صدیوں کے فاصلے بھی حائل ہو سکتے ہیں؟"

اماں بی ایک لمحہ کو سانس لینے کو رکیں" بہت جلد ساس سسر ہم سے جدا ہو کر راہیِ ملکِ عدم ہوئے اور..... میں باوجود کوشش کے خود کو تمہارے ابو کے تصورات اور سوچ

کے مطابق نہ ڈھال سکی۔ یہ سب مقدرات ہیں بیٹی ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا! مگر میں تم سے یہی کہوں گی کہ اسے غلط انداز میں مت سوچو۔ جس کے اثرات تمہاری آنے والی زندگی پر پڑیں خدانخواستہ! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اپنی سوچیں' اپنے خیالات ابھی سے بدل ڈالو۔ میں نہیں چاہتی کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے اور تمہاری آئندہ زندگی رنگ آلود ہو جائے۔" انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔" میں جانتی ہوں تم بہت خوددار اور بلند خیالات کی بچی ہو' مگر جب تک تم اپنی تعلیم مکمل کر کے کوئی باعزت اور بہتر ملازمت اختیار نہیں کر لیتیں' اپنے باپ کی رقم' خیرات سمجھ کر مت لوٹاؤ۔ حق سمجھ کر استعمال کرو اور اپنے بہتر مستقبل کے لیے خرچ کرو۔"

اُس دن کے بعد بھی اماں بی اکثر مختلف موقعوں پر وقتاً فوقتاً اسے ایسی ہی نصیحتیں کرتی رہتیں۔ اونچ نیچ سمجھاتیں۔ باتوں باتوں میں زمانے کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتیں شاید اماں بی کا اصل مشن بیٹی کے دل سے اُس کدورت کو دھونا تھا' جو اپنے ناروا سلوک سے باپ نے اُسے عنایت کی تھی۔

رانی نے سائنس گروپ کو خیر باد کہہ ڈالا تھا اور اب چار برسوں کے بعد بہت اچھے نمبروں کے ساتھ انگلش میں ماسٹرز ڈگری حاصل کر لی تھی۔ خوش نصیبی سے رزلٹ آؤٹ ہونے کے فوراً بعد ہی اُسے پریم گڑھ کے زیب النساء کالج برائے خواتین میں جاب مل گئی تھی۔ جس سے وہ بہت مطمئن اور پرسکون ہو گئی تھی۔ قدرت نے بہت قریب ہو کر اس کی سنی تھی اور اماں بی کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں۔

کالج کا ماحول اور اندرونی دنیا اُس کے تصورات سے بھی بڑھ کر پاکیزہ اور نکھری ستھری نکلی۔ چند ہی ہفتے سہمے سہمے رہنے کے بعد وہ سب سے مانوس ہوتی چلی گئی۔ جب انسان اندر سے مطمئن ہو تو ہر کام میں توقعات سے بڑھ کر کامرانی حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔

وہ بھی اپنی طالبات کو بے حد دل لگا کر اور محنت و مکمل توجہ سے پڑھاتی تھ
چناں چہ جلد ہی اس کی جاں فشانی اور لگن و توجہ سے پڑھانے کی دھوم مچ گئی۔ وہ جت
طالبات میں مقبول تھی اُس سے زیادہ ساتھی اساتذہ قدر کرتے۔ پرنسپل صاحبہ کی ذ
شناس نگاہیں بھی بہت جلد اس گوہر نایاب کو پرکھنے میں کام یاب ہو گئیں اور وہ راؤ
بہت اہمیت دینے لگیں۔ ہوتے ہوتے اس مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا دائرہ اتنا و
ہوا کہ صاحب زادی زیب النساء جو اس کالج کی روح رواں اور پرنسپل تھیں ان۔
ہوتا ہوا یہ تعلق اُن کی بیٹی اور بھتیجی تک پہنچا تو بے تکلف اور اپنائیت بھرے دوستہ
رویے میں تبدیل ہو گیا اور یہ تینوں لڑکیاں آپس میں اتنی شیر و شکر ہو گئیں کہ د
والے حیران رہ جاتے۔



دلاں دیاں راواں تے پیرے کیوں لگدے
مقدراں دے لکھے ہوئے مٹ کیویں سکدے
مینوں رب نے بنایا تیرے لئی او وے
مینے تیرا ناں لکھ کے
بوہے باریاں تے نال کنداں ٹپ کے
آواں گی ہوا بن کے۔ بوہے باریاں

دل کو چھو لینے والے بول تھے۔ جب تک رانی چولہا بند کر کے ہاتھ پونچھتی ہوئی ٹی وی لاؤنج کی طرف بھاگی نغمہ ختم ہو چکا تھا اور اب اسکرین پر کوئی دوسرا ہی منظر تھا۔ اس نے بور ہو کر شرمین کی طرف دیکھا جو صوفہ پر قدرے حیران سی بیٹھی تھی۔ شاید یہ نغمہ اُس کو بھی بھا گیا تھا۔

"ستا آپی! کتنا پیارا گانا تھا؟" رانی کو دیکھ کر وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔

"یہی تو سننے دوڑی تھی۔ مگر ختم ہو گیا۔" رانی نے منہ بنا کر کہا۔

"اچھا' تو یہ آپ کو بھی پسند آ گیا؟ لیکن اس کا مطلب معلوم نہیں کیا ہے؟"

شرمین نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔
"میں یہ لفظ کئی بار سن چکی ہوں مگر زبان بہت مشکل ہے۔ سمجھ میں نہیں آتی۔ ہاں اچھی بہت لگتی ہے دل کو بھی کانوں کو بھی۔"
"لیکن جناب! ہمیں تو خوب سمجھ میں آتی ہے یہ زبان اور اس کا تلفظ بھی۔" رانی اُس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔
"ہائے آپ کو پنجابی زبان آتی ہے؟" شرمین نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں پھر خود ہی پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی۔ "ہاں..... ٹھیک تو ہے۔ آپ کا کالج بھی تو گاؤں میں ہے‘ وہاں سیکھ لی ہوگی مگر ہمیں کون سکھائے بھلا؟"
"ارے واہ! تمہیں کس نے کہا میرا کالج گاؤں میں ہے؟" رانی برا مان کر بولی۔
"وہاں تو اتنے ایجوکیٹڈ لوگ ہیں‘ سب ایک سے ایک بڑھ کر تعلیم یافتہ بلکہ "تمدن پلٹ" ٹائپ کے زیادہ ہیں۔"
"اچھا تو "تمدن پلٹ" کو پنجابی بولنا منع ہے؟" شرمین نے شرارتی لہجے میں اُسے چڑایا۔
"منع کیوں ہے؟" رانی مزید چمک کر بولی۔
"مگر تم تو کہہ رہی ہو آپ نے کالج سے پنجابی زبان سیکھ لی ہوگی۔ بھلا وہاں میں پڑھنے جاتی ہوں یا پڑھانے؟"
"اللہ..... آپ تو موڈ خراب کرنے لگیں بلاوجہ۔"
شرمین نے سنبھل کر جواب دیا مگر انداز اب بھی شرارتی تھا۔ "وہ تو علی بھائی کہہ رہے تھے ایک دن۔"
"ایسی بے پرکی اور بے تکی خبریں وہی اُڑایا کرتے ہیں۔" علی کے نام پر وہ

مزید جل بھن گئی۔ بگڑ کر بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا وہ روزانہ یہاں کیوں چلے آتے ہیں‘ کیا کام ہے انہیں؟ ہماری اماں بی بھی بہت سیدھی ہیں‘ ہر کسی پر بھروسا کر لیتی ہیں۔"
"ارے خاموش ہو جایئے آپا۔" شرمین نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُس کو خاموش کرایا۔ "اماں بی نے سن لیا تو فضیحت کر ڈالیں گی۔ وہ علی بھائی کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتیں۔ بہت قدر کرتی ہیں ان کی۔"
"اماں ہیں کہاں؟" رانی نے چاروں طرف دیکھ کر پوچھا۔
"پچھلے آنگن میں گرم کپڑوں کو دھوپ "کھلا" رہی ہیں۔" شرمین نے ہنس کر بتایا۔ "آپ نہیں جانتیں‘ وہ ہر سال آتے جاڑوں میں یہ کام ضرور کرتی ہیں۔"
"وہ تمہارے علی بھائی پھر آئے تھے کیا؟" رانی نے رازداری سے دریافت کیا۔
"ہاں..... ہفتے میں ایک دو چکر تو لگا ہی جاتے ہیں مگر آتے بہت محتاط ہو کر۔ جب بھی میں گھر پر ہوں اور گیٹ کھولنے جاؤں ضرور پوچھتے ہیں۔ "تمہاری آپا تو نہیں ہیں گھر پر؟"
"کیوں..... کیا میں انہیں کاٹ کھاؤں گی۔" رانی کو پھر تاؤ آ گیا۔ "لوگ بنتے تو ایسے ہیں جیسے بڑے سیدھے ہوں اور تم بھی کان کھول کر سن لو۔ اُن سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم نہیں کون ہیں کون نہیں۔ جہاں کسی نے اچھی طرح بات کی‘ لگیں اُسی کے گن گانے۔ لو بھلا! اب میرا کالج گاؤں میں بتا دیا۔ خود ہی ہوں گے دیہاتی‘ اُجڈ‘ گنوار اور جانگلوس کہیں کے۔ ہر وقت میرے خلاف کان بھرتے رہتے ہیں تمہارے۔ اب اُن عقل سے پیدل بندے کو یہ کون بتائے کہ مجھے تو بہت پہلے سے پنجابی زبان آتی ہے۔ بولنی بھی اور سمجھنا بھی۔" رانی بولنے پر آئی تو

بولتی چلی گئی۔

ساتھ ہی اُسے مہینوں پہلے کی وہ شام بھی یاد آنے لگی جب اُس نے پہلی مرتبہ بس میں یہی ریکارڈ سنا تھا۔ اُسی روز تو علی کو بھی پہلی دفعہ ہی دیکھا تھا۔ یوں تو رانی اُس کے رکھ رکھاؤ اور شخصیت سے بہت مرعوب ہوئی تھی مگر اپنی غیر موجودگی میں ان کا بار بار گھر پر آنا اور لگا ہے بگا ہے شرمین کی وساطت سے ان کی چھیڑ چھاڑ سے چڑنے لگی تھی۔

شرمین جو اُس کی جلی کٹی باتوں سے فِس فِس کر دوہری ہوئی جا رہی تھی اپنے قہقہے پر قابو پا کر بولی۔ "آپا...... آپ یہ تو چھپا ہی گئیں کہ پنجابی زبان اگر سچ آپ نے کالج سے نہیں سیکھی تو پھر کہاں سے سیکھی تھی؟"

اُس کا انداز اب مشکوک تھا جسے محسوس کر کے وہ چیخ پڑی۔

"بالکل ہی گھاس کھا گئی ہے کیا شرمین کی بچی! تم اماں بی سے تصدیق کر سکتی ہو کہ یہ زبان مجھے "ماسی مریاں" نے سکھائی تھی۔"

"ماسی مریاں؟" شرمین نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں۔ "یہ کون ذات شریف ہیں؟"

"تھیں ایک۔" رانی نے بے پرواہی سے جواب دیا۔ "تم بہت چھوٹی ہوا کرتی تھیں۔ دونوں ماں بیٹی معلوم نہیں کہاں سے پھرتی پھراتی آ گئی تھیں۔ بہت غریب اور بے آسرا تھیں۔ اماں بی نے رحم کھا کر انہیں اپنے گھر رکھ لیا۔ ابو نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ کافی عرصے ہمارے ہاں رہیں۔ ماسی مریاں سے اماں بی کو بہت آرام تھا گھر کے اوپر کے سارے کام اس نے سنبھال رکھے تھے۔ اس کی بیٹی شاداں میرے اور تمہارے ساتھ لگی رہتی۔ پھر بعد میں شاداں کی شادی کے سلسلے میں ماسی مریاں اپنے گاؤں گئی تو واپس ہی نہ آئی۔ اپنی بیٹی کے ساتھ ہی کہیں رہ گئی۔"

"اچھا...... تو آپ نے پنجابی زبان انہی سے سیکھی تھی۔" شرمین نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں...... یہ حقیقت ہے۔" رانی نے جواب دیا۔ "شاداں اور ماسی مریاں ہم لوگوں سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرتیں مگر آپس میں پنجابی بولا کرتی تھیں۔ مجھے یہ زبان بہت پیاری لگتی۔ رفتہ رفتہ میں بھی سیکھ گئی بلکہ شاداں سے تو پنجابی ہی بولا کرتی۔ اماں بی بے چاری کو پتا بھی نہ چلتا۔ دوپہر میں جب وہ کمرا بند کر کے تمہیں لے کر سو جایا کرتیں تو میں دبے پاؤں وہاں سے فرار ہوتی تو لان کے اُس کونے میں جہاں املتاس اور املی کے اونچے پیڑوں کے نیچے شاداں اپنی کپڑے کی گڑیاں سجائے کھیل رہی ہوتی' آ کر دم لیتی۔ بڑی ہی کمال کی لڑکی تھی شاداں بھی۔ اکیلی ہی گڑیوں کی شادی کرتی۔ انہیں سجاتی سنوارتی' انہیں رخصت کرتی اور پنجابی ٹپے گاتی تھی۔"

"ٹپے؟ پنجابی ٹپے کیا آپا؟" شرمین نے احمقوں کی طرح دریافت کیا۔

"جس طرح اردو شاعری میں لوک گیت ہوتے ہیں۔" رانی نے اُسے سمجھایا۔ "اس طرح بس تم یہ سمجھو کہ پنجابی لوک گیتوں کی ایک قسم کو "ٹپے" کہا جاتا ہے۔"

"آپ کو تو آتے ہوں گے آپا مجھے بھی سنایئے!"

شرمین نے خوشامد کی۔ رانی کا موڈ خود بخود درست ہو چکا تھا۔ کھنکار کر بولی۔

"اچھا' دو تین ٹپے سنا دیتی ہوں۔ ویسے کوئی خاص آتے تو نہیں مجھے۔" اُس نے ایک دو لمحے ذہن پر زور دیا پھر بلند آواز میں گانے لگی۔

حقہ پی وے او دم لا کے
آ دن دیاں بڑیاں خوشیاں
جاندے او غم لا کے
پانی تل کے توں رج پیا

ماہیے واو دیدار کرکے
کے واج کیتا

"رانی یہیں تک گا سکی تھی کہ شرمین کو مزید ہنسی ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ وہ منہ دبائے زور زور سے قہقہے لگاتی ہوئی کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ دراصل رانی کی آواز گانے کے لیے بالکل غیر موزوں تھی۔ زبان تو ویسے ہی شرمین کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اوپر سے اس کی غیر دل کش آواز اور بے سرا لہجہ۔

وہ ہنستے ہنستے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

رانی کے ٹپّوں میں بریک لگ گیا۔ وہ اُسے بے تحاشہ برا بھلا کہنے لگی۔

"خود ہی گانے کو کہا اور خود ہی......"

ان دونوں کا شور و غل سن کر اماں بی جانے کب کمرے میں آ گئی تھیں۔ رانی کے بے سرے ٹپے انہوں نے بھی سنے۔ مسکرا وہ بھی رہی تھیں مگر احتیاطاً ہنسی روک رکھی تھی۔

"کیا ہوا بیٹی! کیوں اتنی چراغ پا ہو رہی ہو؟" انہوں نے تجاہلِ عارفانہ برتا۔

"ہونا کیا؟" رانی نے بے مزہ ہو کر جواب دیا۔ "خود ہی خوشامد کرنے لگی کہ سنا دو۔ میں نے شادو سے سنے ہوئے ٹپے سنائے تو...... ہنسی کا دورہ پڑ گیا کمبخت کو"

اماں بی ہنسنے لگیں۔

"کیوں؟ میں نے اُسے ٹپوں کے بجائے لطیفے سنا دیے اماں بی؟" رانی اب تک چڑھا ہوا تھا۔

"ارے جانے دو بیٹا!" اماں بی نے معاملہ رفع دفع کرانا چاہا۔ "تمہیں پتا ہے اُسے تو ہنسنے شور مچانے کا موقع چاہیے۔ ہر بات میں جگت بازی کا پہلو نکالتی ہے۔ تم یہ بتاؤ آج تمہیں شادو کہاں سے اتنی مدت بعد یاد آ گئی؟"

"بلا وجہ کہاں سے یاد آ گئی اماں۔" رانی بدستور جلے بھنے انداز میں بولی۔

"وہی چڑیل پوچھ رہی تھی کہ آپ نے پنجابی زبان کہاں سے سیکھی ہے؟"

"ہاں سچ کہتی ہو بیٹی۔" اماں بی نے گزرا وقت یاد کر کے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔

"وہ دونوں ماں بیٹی تو بہت ہی سادہ دل اور کھری نیت کی لوگ تھیں۔ ہا...... کیا وقت تھا وہ بھی! اور اب کبھی تم ماسی مریاں بے چاری کو دیکھ لو تو پہچان بھی نہ پاؤ!"

"لیکن...... آپ نے کہاں دیکھ لیا اُسے؟" رانی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کافی دن گزرے آئی تھی ایک دن۔" اماں بی نے افسوس کے لہجے میں جواب دیا۔ "بے چاری بہت ہی کم زور ہڈیوں کا ڈھانچا ہو رہی تھی۔ مجھے اُس کی حالت دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ اب تو وہ کسی کام دھام کے لائق بھی نہیں رہی۔ یہاں شہر سے باہر ہی کسی بستی کا نام بتا رہی تھی' کسی جھونپڑی میں رہتی ہے۔ بتا رہی تھی کہ شادو کے کئی ایک بچے ہیں۔ شوہر اُس کا بہت سخت گیر اور اکھڑ قسم کا تھا۔ ساس سے بہت اکھڑا اکھڑا سا رہتا تھا۔ یہ ٹھہری غیور فطرت اور محنت کش عورت۔ کافی عرصے تو اپنی بے پناہ مامتا اور بیٹی کی محبت میں اس کے در سے چمٹی رہی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ شادو بھی اور کچھ تم سمجھو غربت بھی بہت بری شے ہے' ماں سے کھنچی کھنچی سی رہنے لگی ہوگی۔ بس ایک روز...... ماسی مریاں چپ چاپ سے بیٹی داماد کے گھر سے نکل آئی۔"

"اللہ میری توبہ۔" رانی نے دیر سے رکا ہوا سانس لیا۔ "میں بھی—— وہ...... شادو ہی مر گئی شاید۔"

"ارے...... اللہ نہ کرے" اماں بی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "میرا خیال ہے اماں!" رانی ان کے قریب آ بیٹھی۔ "کیوں نہ ہم ایسے موقع پر ماسی مریاں کا سہارا بن جائیں اور اُسے گھر رکھ لیں؟"

"لیکن بیٹی! اب وہ کام کاج تو کر نہیں سکتی!" اماں بی نے اُس کی لاچاری بیان

کی۔

"اسی لیے تو میں یہ بات کہہ رہی ہوں۔" رانی نے بڑی سنجیدگی سے جواب د "آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ آخر ایک فرد کے اضافے سے ہم کسی زبردس مالی بحران سے تو دوچار ہونے سے رہے۔ گھر کا کام کاج جس طرح ہوتا ہے۔ و رہے گا۔ ماسی مریاں سے کوئی خدمت لینا ضروری تو نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ گھر م ایک بزرگ کی موجودگی بڑی خوش آئند رہے گی۔"

"خوش رہو میری بچی!" اماں بی نے بے اختیار اُسے گلے لگا لیا۔ "بہت ا ہوئی اور قابلِ قدر سوچ ہے میری بچی کی۔ اب اگر کبھی ماسی مریاں آ گئی تو یقیناً م اُسے بڑی خوشی اور بے فکری سے اپنے گھر میں روک سکوں گی۔ یہ یقیناً ثواب کا کا ہوگا۔"



For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

بادل اتنے گھیرے اور سیاہ کہ دوپہر کے دو بجے اُمنڈتی شام کا سماں لگ رہا ا۔ جنگل کا راستہ آوارا ہواؤں کے سرد جھونکے بس کا انتظار اور تنہا لڑکی۔

ارے جھلاہٹ اور کچھ خوف و تشویش کے احساس سے رانی کی آنکھیں بار بار لی ہونے لگیں۔

سویرے اماں بی کے منع کرنے کے باوجود گھر سے کالج کے لیے نکلی تھی تو بارش کا پتا تو ای امکان نہیں تھا۔ دن کے بارہ بجے جب وہ پیریڈ لے رہی تھی تو ہلکی پھوار نے لگی۔ آسمان سے زمین کی طرف چھن چھن باجرے کی سی بوندوں کا تسلسل بندھ لیا۔

آسمان کے انتہائی گوشے میں سیاہ بادلوں کے دل کے دل جمع ہونے لگے جیسے وئی سازش کر رہے ہوں۔ ہوا کے یخ کر دینے والے جھکڑوں میں شدت پیدا ہوئی رانی نے فوراً ہی واپس جانے کی ٹھان لی لیکن مسلسل ایک گھنٹے سے کھڑے کھڑے ن کے پاؤں جواب دیے جا رہے تھے۔ اضطراب تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر بس تھی کہ آ کے نہ دے رہی تھی۔ ایک بس آئی بھی تو اس میں رش کا یہ عالم تھا کہ وہ باوجود

زار چاہنے کے بھی کھڑے اور لٹکے ہوئے مردوں کے پاس کھڑے ہونے کی
نہ کر سکی۔

اپنی قوم کے حسین و جمیل دل و دماغ اور ان کی سوچوں اور خیالات سے
خوب واقف تھی' جو سفر کے دوران دور سیٹ پر بھی لڑکی کو آنکھوں ہی آنکھوں
تولنے' گھورنے اور کھا لینے کی ہر ممکن کوشش کر لینا اپنا پہلا فرض سمجھتے ہیں۔
شکاریوں کی طرح کبھی رنگین چشموں سے اور کبھی اخبار کی اوٹ سے مسکرا مسکرا
دیکھتے ہیں جیسے آج ہی گھر سے باہر کی دنیا اور کوئی لڑکی دیکھی ہو اور پھر سفر
طویل یا مختصر کیوں نہ ہو' اسی آنکھ مچولی میں گزر لیتے ہیں۔

ایسے ماحول اور فضاؤں کو پرکھی ہوئی رانی' مردوں کے دوش بدوش کھڑے
سفر کرنے کی ہمت کیسے کر سکتی تھی۔ انتہائی نڈر اور پراعتماد ہونے کے باوجود
بے باک نہیں ہو سکتی تھی!

دور دکھائی دینے والے ریت کے ٹیلوں اور درختوں کے جھنڈ کے عقب
گہرے سیاہ بادلوں کا پرے کا پرا نمودار ہوا اور دھما دھم گرجتا برستا عین سر پر آ گیا
وہ زور زور سے کڑکتی برق بجلی اور بارش کی تیز بوچھاڑ سے گھبرا کر شیشم
درخت کی طرف بھاگی اور بے اختیار اس کے موٹے اور مضبوط تنے سے
کھڑی ہو گئی۔

مینہ کچھ ایسا ٹوٹ کر برسا کہ جلد ہی شیشم کے گھنے پتوں سے بھی بوند
ٹپکیں۔ آن کی آن میں وہ پوری بھیگ گئی۔ جوتوں میں پانی بھر گیا۔ جرابیں
گئیں اس پر ستم ہڈیوں میں اتر جانے والے یخ بستہ جھکڑ! اپنی بے بسی اور لاچا
خیال سے وہ ہراساں ہو کر رو دی اور موسلا دھار بارش کے بہتے پانیوں میں
کھڑے مسافروں کو پتا بھی نہ چلا کہ کسی کی آنکھیں بھی ساون بھادوں کی طر

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

یا ہیں۔"

ان بھاری لمحات میں جبکہ اندر باہر ہر طرف ساون بھادوں کی جھڑی لگی تھی' اس
تصور میں ابو کی لمبی چوڑی گاڑی آ ٹھہری۔ بے بسی اور نظر انداز کیے جانے کا
اس شدید قسم کی محرومی بن کر دل و جاں پر محیط ہو گیا۔

"ابو... میرے بے حس' بے درد اور پتھر دل ابو!"

رانی کا جی چاہا' بلک بلک کر با آواز بلند رونے لگے۔
چلا چلا کر لوگوں کو بتائے کہ وہ کس باپ کی بیٹی ہے۔

بارش کا زور کچھ ٹوٹا تو وہ اپنے ارد گرد دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ بارش سے بچاؤ کے
کتنے ہی اسکوٹر سوار اس درخت کے نیچے جمع ہو گئے تھے۔ اب اچھی بھلی بھیڑ سی ہو
تھی۔ اُسے اپنے بھیگے ہوئے لباس اور کانپتے ٹھٹھرتے وجود سے خود ہی خجالت
لگی۔ وہ مزید سمٹ کر رہ گئی۔ بالوں سے قطرہ قطرہ ٹپکتے موتی چہرے کو بھگو رہے
ان لمحات میں وہ ایسی نروس اور اپ سیٹ ہو چکی تھی کہ ساری اکڑ فوں اور
طراری ہوا ہو کر رہ گئی تھی۔ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اپنی آج کی درگت اور شامت پر
یا ہنسے؟ غم و اندوہ سے مر جائے یا زندہ درگور ہو جائے۔

چناں چہ اس دفعہ انسانوں سے کھچا کھچ بھری بس آ کر رکی تو وہ رش اور دھکم پیل کا
کیے بغیر اس کی طرف لپکی۔

ذہن میں ایک ہی خیال تھا' اس ماحول سے نکل بھاگو۔"

شدید ہیجانی کیفیت میں وہ نگاہیں جھکائے جھکائے سڑک کراس کرنے لگی۔
کنڈیکٹر چلا چلا کر مسافروں کی ہانک لگا رہا تھا۔ وہاں موجود ہر شخص کی نظریں
تیروں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ بس کی چھت سے لپٹے' دروازوں سے لٹکے اور
یوں سے جھانکتے لوگوں کے لیے سرد ہواؤں' برستی بارش اور کڑکتی بجلی کے ساتھ

بھیگی ہوئی تنہا لڑکی ایک دلچسپ تماشا بن گئی تھی۔

عین اس وقت جب کہ وہ بس میں سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھی اُنہی کی
حورت گاڑی اُس سے تقریباً مس ہوتی ہوئی جھٹکے سے رُکی دروازہ کھول کر علی
جلدی سے اُس کا ہاتھ تھاما' چشم زدن میں فرنٹ ڈور کھول کر دھکیلا اور ایک سیکنڈ
بھی کم وقفے میں گاڑی لے اُڑے۔

اُن کا چہرہ کسی اندرونی احساس اور شدید کوفت سے تپ رہا تھا۔ وہ تاسف
دکھ کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ لب بھینچے گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔

اندر کے نیم گرم اور خواب ناک ماحول میں خنکی کا اثر زائل ہوا تو شانوں
چپکا ہوا دوپٹہ اور بھیگے بھیگے لباس نے اس میں اپنی بے سروسامانی' حالات کی ا
ستم ظریفی اور پھر علی کی اچانک آمد' ڈرامائی انداز' انوکھا رویہ' اور ان کی
موجودگی نے اُسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اُس کا نروس ذہن اپنی کم مائیگی اور
سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ احساسِ پشیمانی حد سے بڑھا۔ اُس نے ڈیش بورڈ پر سر
اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بارش کی تیز آواز کے باوجود علی اُس کی سسکیاں صاف سن رہے تھے۔ مگر
جمود کی سی کیفیت میں سامنے نظریں جمائے ڈرائیونگ کی طرف متوجہ رہے
اسکرین پر رانی کے آنسوؤں کی طرح ایک کے بعد ایک بوندیں ٹوٹ ٹوٹ کر
تھیں۔ یوں جیسے کسی نے سچے موتیوں کی مالا توڑ دی ہو یا بساطِ آسمان پہ ت
ستاروں کی بارات اُتر آئی ہو۔ مگر اس وقت اُن دونوں کا ذہن مختلف خیالا
آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ طوفانی جھکڑوں اور دھواں دھار برستی بارش سے عاجز آ کر
نے گاڑی سڑک سے اُتار کر برگد کے ایک گھنے پیڑ کے نیچے کھڑی کر دی اور
ایک لفظ کہے بغیر اپنا گرم چار خانے کا کوٹ اُتار کر اُس کے لرزتے کانپتے شا

لا دیا اور رانی منع بھی نہ کر سکی حواس درست ہوئے تو اُس نے پرس میں سے خشک
رومال نکال کر آنکھیں پونچھیں جو شدتِ گریہ سے متورم ہو رہی تھیں۔ تب علی نے
سامنے سے نظریں ہٹا کر اُسے جی بھر کر دیکھا۔ رخساروں پر چپکی ہوئی بالوں کی ننھی ننھی
لٹوں اور سرخ سرخ چہرے کو دیکھ کر وہ متضاد کیفیت کے شکار ہو گئے۔

غصہ بھی آیا ترس بھی آیا ہمدردی بھی محسوس ہوئی۔ افسوس بھی ہوا۔ اماں بی سے وہ
بہت زیادہ گھل مل گئے تھے اور ان لوگوں کے گھریلو حالات' ابو کی بے اتفاقی' بے
مروتی اور رانی کے فیصلوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ دلی طور سے ان تینوں ماں
بیٹی کے بہت ہمدرد اور خیر خواہ تھے۔ گو کہ رانی کو اُن کی اس حد تک کی معلومات اور
گہرے ربط کا علم نہیں تھا' تاہم شرمین کی زبانی ان کا ذکر سن سن کر اجنبیت کا احساس
ضرور کم ہو گیا تھا اور آج ان لمحات میں تو انہوں نے فرشتۂ رحمت کی طرح نمودار ہو کر
اُس کی امداد کی تھی۔ وہ ممنون تھی اُن کی۔ کم سے کم لوگوں کی خبیث نظروں کے
اشاروں سے تو محفوظ تھی اس وقت!

انہوں نے بہت سنجیدگی سے اُسے ڈانٹ پلا دی۔

"آپ کو یہ رائے کس نے دی تھی مس منصورا کہ آپ ایسے خراب موسم میں گھر
سے نکل پڑیں؟ اگر آج لیکچر نہ دیتیں تو آپ کی سروس ختم ہو جاتی؟"

"صبح ایسا موسم کب تھا؟" رانی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"بزرگوں کی حکم عدولی کی سزا ایسی ہی ہونی چاہیے۔ اماں بی کے روکنے پر بھی
آپ کو خیال نہ آیا۔" وہ اسی طرح سنجیدگی سے بولے۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" رانی مارے حیرت کے پوری آنکھیں پھاڑ کر ان کی
طرف دیکھنے لگی۔ پل کے پل اُسے لگا یہ ساحر آنکھوں والا شخص سچ مچ جادوگر ہے جو دلوں
کے بھید جانتا ہے اور دوسروں پر گزرنے والے حالات بھی۔

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

علی نے لحہ بھر اُسے حیران ہی رہنے دیا۔ پھر بتانے لگے۔ "جناب! میں کچھ دیر قبل اماں بی کی ہی خدمت میں بیٹھا تھا۔ تب...... بس اچانک ہی خیال گزرا تھا کہ کہیں...... آپ......" انہوں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی اور ڈیش بورڈ پر لگے ہوئے لائٹر کا بٹن دبا کر سگریٹ سلگانے لگے۔

اُن کا موڈ آپ ہی آپ درست ہو گیا۔ چہرے پر بہتی خشونت کم ہو گئی اور اب ہلکے ہلکے دھوئیں کے پس منظر میں اُن کے خوب صورت ہونٹوں پر ایک دل نواز سا تبسم چمک رہا تھا اور مخمور آنکھوں میں مستی سی چھا رہی تھی۔

خبر نہیں کس کے قرب کا طلسم تھا۔

بھیگے بھیگے موسم کا اثر یا کوئی خوش آیند سا خیال' بہرحال' کوئی بات تھی ضرور جسے رانی اپنی اُلجھن اور پشیمانیوں میں محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔ تھوڑا سا ہنس کر انہوں نے اُس کے بھیگے وجود پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی پھر سامنے دیکھتے ہوئے بولے۔ "بارش تھمنے کے تو کوئی آثار نظر نہیں آ رہے اور آپ کو سردی بھی لگ رہی ہو گی۔ براہِ کرم آپ یہ کوٹ اچھی طرح لپیٹ لیجیے۔ خدانخواستہ ٹھنڈ لگ گئی تو مجھے...... میرا مطلب ہے اماں بی بہت پریشان ہوں گی اور آپ کے بھی پڑھنے پڑھانے کا سارا انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اپنا نہیں تو دوسروں...... یعنی اپنی اسٹوڈنٹس کے مفاد کا تو خیال رکھیے۔"

رانی کو ان کی باتوں میں کافی بے ربطگی سی محسوس ہوئی۔ وہ قدرے پریشان ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگی۔ تاہم اُس نے کوئی اعتراض نہ کیا اور اُن کا کوٹ جو اُنہوں نے بے توجہی سے سیٹ کی پشت پر ڈال دیا تھا' اُٹھا کر بڑی احتیاط اور اپنائیت سے اپنے چاروں طرف لپیٹ لیا۔

علی کو ایک گونہ اطمینان کا احساس ہوا جیسے رانی نہیں' بلکہ وہ خود سردی کی شدت

...تنوبا ہو گئے ہوں۔ انہوں نے اطمینان کا گہرا سانس کھینچا پھر کہنے لگے۔ "آپ یہی تھیں کہ" جی ہماری پرنسپل صاحبہ تو ایک نواب زادی ہیں۔" انہوں نے کالج قائم کیا اور خود بلا معاوضہ خدمت انجام دیتی ہیں۔ تو...... ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کی پرنسپل نواب زادی زیب النساء صاحبہ کے انسانیت پرست دھڑکتے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ وہ لیکچرارز کے آنے جانے کے لیے کم از کم ایک بس کا ہی انتظام کر دیں!! کیا یہ خدمت خلق نہ ہو گی!"

پھر رانی کا بگڑتا موڈ دیکھ کر جلدی سے اضافہ کیا۔ "ہاں...... بھئی دیکھیے وہ بس تو کیا ایک ہزار کاریں چلوا سکتی ہیں اور مثال کے طور پر یہ کار بھی انہی کی ہے جس میں اس وقت میں بھی ہوں۔"

مگر ان کی تمام احتیاط کے باوجود رانی بھڑک چکی تھی۔ اُن کی لمبی چوڑی تمہید اور ...چنے والا لہجہ اُسے بُرا معلوم ہوا۔ تاہم اس نے تحمل سے کام لیا اور سنجیدگی سے بولی۔ "میں نے اُس روز اُن کی سیرت اور اعلیٰ کردار کے لیے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا بلکہ بہت کم ہی بتایا تھا کیوں کہ جو خدمت خلق وہ کر رہی ہیں درحقیقت اُس سے بھی کہیں زیادہ عظیم اور بلند تر ہیں۔ عام ذہنیت کا انسان تو اُن کی ہمسری کر ہی نہیں سکتا۔ آپ کے نزدیک یہ بات صرف مذاق ہے جبکہ ایک بس کا انتظام کروا دینا اُن کے لیے چنداں وقت طلب مسئلہ نہیں۔ صحیح صورت حال یہ ہے کہ اُن کے ہوسٹل کا انتظام اتنا مکمل اور اعلیٰ ہے کہ تمام لیکچررز ہر روز آنے جانے کے بجائے ہفتہ بھر وہیں رہنا پسند کرتی ہیں۔ وہاں کی رہائش بالکل فری ہے اور رہنے کے اخراجات نواب فیملی خود برداشت کرتی ہے۔ ہر طرح کی سہولت اور آسائش ملتی ہے ان لوگوں کو۔ میں ہی چوں کہ اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے رہ نہیں سکتی اور پھر بس اسٹاپ کے سامنے سے تو کالج کی عمارت نظر آتی ہے اس لیے ہر روز کے آنے جانے کو سہل سمجھتی ہوں۔ اب وہ فقط

میری وجہ سے تو ایک پوری بس چلوانے سے رہیں۔ نہ میں ایسی چھوٹی بات اُن سے کہہ سکتی ہوں۔ ویسے میں نے کبھی اُن سے اپنی اس دشواری کا ذکر بھی نہیں کیا ورنہ انتظام...."

علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اوہو.... آپ تو پھر اُن کی بلکہ...... لاڈلی سی لگتی ہیں۔" اُسے جلانے کو ایسے مشکوک لہجے میں کہا کہ نتیجہ اُن کے حسب منشاء نکلا۔

وہ چیخ کر بولی۔ "اور کیا۔ وہ تو مجھ سے محبت و شفقت سے پیش آتی ہیں۔ ان کی صاحب زادی افروز جہاں اور بھتیجی شاہ جہاں میری بہت گہری اور اچھی دوست ہیں۔ ہر روز مجھے 'قصر دیدار' بلایا کرتی ہیں۔" اُس کے لہجے میں بچوں جیسی معصومیت اور فخر جھلکنے لگا۔

"قصر دیدار!" وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسے۔ پھر سادگی سے پوچھنے لگے۔

"اچھا۔ تو پھر صاحب زادہ دیدار بھی بہت پیار کرتے ہوں گے آپ سے؟"

"جی.... کیا مطلب؟" رانی بھونچکی رہ گئی اور حیران ہو کر اُن کی صورت تکنے لگی۔

علی جلدی سے بات بنا کر بولے۔ "بھئی آپ خود ہی تو بتا رہی ہیں کہ دونوں صاحبزادیوں آپ کو بہت چاہتی ہیں زیب النساء بیگم بہت محبت کرتی ہیں تو میں سوچا کہ صاحبزادہ دیدار کیوں پیچھے رہنے لگے۔ وہ بھی آپ سے بہت پیار......"

"شٹ اَپ......" رانی کانوں تک سرخ پڑ گئی اور ان کی طرف سے رُخ پھیر لیا۔

"ارے.... آپ تو بہت خفا ہو گئیں مس منصور!" وہ ہنس کر بولے۔ "صاحب زادے بہت بوڑھے ہیں یا.... بدصورت ہوں گے؟"

"میں نے تو آج تک انہیں دیکھا تک نہیں۔" رانی کی بات سے بے ساختہ بلا ارادہ ہی نکلا۔

مگر کہتے ہیں پچھتائی کیوں کہ اب کار کے محدود سے ماحول میں علی کے قہقہے گونج رہے تھے اور وہ اس طرح شرمندہ ہو رہی تھی جیسے کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔

باہر بارش یوں برس رہی تھی جیسے آج کے بعد پھر کبھی نہ برسے گی۔ گھنگھور گھٹائیں تھیں کہ امنڈی چلی آ رہی تھیں۔ ہواؤں کے باؤلے جھکڑ تھے کہ چلے جا رہے تھے۔ سڑک سے نشیب کی طرف چھاجوں مینہ پرنالوں کی صورت بہتا چلا جا رہا تھا۔ تیز بوچھاڑ کی وجہ سے ٹریفک کی آمد و رفت تھمی ہوئی تھی۔ شاید ان کی طرح سے دوسرے لوگ بھی کہیں پناہ گزین تھے۔

اس طوفانی موسم اور ہر لحظہ بڑھتی تاریکی کے باوجود جانے کیوں رانی اندر سے پہلے کی طرح غیر مطمئن اور ہراساں نہیں تھی۔ سچ ہے شاہراہ حیات پر اچانک مل جانے والے کچھ افراد کم وقت میں زیادہ اعتماد حاصل کر لیتے ہیں اور غیر ہو کر بھی اتنے قریب اتنے اپنے اور اتنے عزیز سے لگتے ہیں کہ جسے بے پناہ بھروسا اور اعتماد ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس تعلق خاص کو دل محسوس تو کر سکتا ہے بیان نہیں کر سکتا۔

تھوڑی دیر کے بعد علی نے اپنی شریر قسم کی مسکراہٹوں پر قابو پا لیا تو سگریٹ کا گہرا کش لے کر بولے۔ "چلیے چھوڑیے بہت انجوائے کر لیا۔ آپ یہ بتایئے مس منصور! کہ آپ ایک چھوٹی سی گاڑی کیوں نہیں خرید لیتیں؟ کم از کم ان واہیات قسم کی بسوں کے بور سفر سے تو نجات حاصل کر لیں گی!!"

وہ ان کے خواہ مخواہ ہنسنے سے یوں ہی بھری بیٹھی تھی جلے بھنے لہجے میں بولی۔

"سب کو اپنے ہی زاویہ نظر سے مت دیکھا کیجئے۔ میرے پاس لاکھوں روپے کے

نوٹ فالتو نہیں ہیں۔"

"ارے توبہ کیجئے..... پناہ مانگئے۔" وہ قیمتی انگوٹھیوں والے ہاتھ سے اپنے کان چھو کر بولے۔ "لاکھوں روپے کی بات تو یہ خاکسار نہیں کر رہا..... اتنی سکت تو مجھ میں بھی نہیں۔ یہ بے چاری سیکنڈ ہینڈ لی تھی۔ بہ مشکل اسی پچاسی ہزار میں پڑی تھی مجھے۔"

"تو چمکاتی گاڑی اور اسی پچاسی ہزار روپے؟" رانی نے بے اعتباری سے انہیں گھورا۔

"ہاں..... ہاں....." وہ یقین دلانے والے انداز میں جلدی سے بولے۔

"ارے آپ کو یقین نہیں ہے! یہ تو سب نئے کلر اور بہترین ریپیر کرنے والے کا کمال اور ہنر ہے ورنہ یہ تو سیکنڈ ہینڈ ہے۔ صرف کلر سے نئی نئی سی ہو گئی ہے۔ یقین نہ آئے تو اتنی ہی رقم میں آپ کو دلا دوں؟"

رانی راکھ ہوشیار ہونے کے باوجود نا تجربہ کار اور ایسے حساب کتاب سے نا آشنا تھی۔ دل ہی دل میں اُس نے اپنے اور اماں بی کے بینک بیلنس کا اندازہ کیا۔ ایک سیکنڈ کے بھی ہزارویں حصے میں اُسے بسوں کے دھکوں، وقت کی خرابی اور آخر میں آج کے دلدوز اور عبرت آموز واقعہ کا خیال آیا اور اُس نے لاشعوری طور پر اُن کے کوٹ کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا اور سوچتی ہوئی کہنے لگی۔ "مشورہ تو آپ کا بہت مفید ہے اور اسی نوے ہزار بھی بہت مشکل مرحلہ نہیں مگر قباحت یہ ہے کہ گاڑی لوں تو ڈرائیور بھی رکھوں؟"

"تا کہ وہ آپ کو گاڑی سمیت لے اُڑے۔" اُن کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ پھر پیشانی پر ہاتھ مار کر بولے۔ "آپ بھی عقل سے پیدل ہی رہیں۔ ذرا بتایئے بھلا! اگر گاڑی خرید کر ایک عدد مرد ڈرائیور بھی رکھا جائے تو رقم ضائع کرنے سے فائدہ! بس کا ڈرائیور اتنا برا تو نہیں ہوتا بھلا؟"

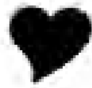
"آ..... آپ کا مطلب ہے خود چلاؤں؟" وہ وحشت زدہ ہو کر چلائی۔

"ن..... جی..... نا..... کالج کے زمانے میں ایک بار میں نے اپنی ایک دوست کی گاڑی پر ٹرائی کی تھی۔ اُف..... خدا کی پناہ! یوں لگتا تھا جیسے آگے پیچھے کی طرح ساری ٹریفک میرے سر پر چڑھ آئی ہو..... خدا بچائے۔"

"ہے بزدل!" علی نے جانے کس موڈ میں آ کر اُس کے بھیگے بالوں پر ہلکی سی چپت رسید کر دی۔

پھر بڑے شاہانہ انداز میں کہنے لگے۔ "ہم تمہیں ایک ماہ کے اندر اندر گاڑی چلانا سکھا دیں گے اور ساتھ ہی لائسنس ڈرائیونگ بھی دلوائیں گے فری بلا معاوضہ۔"

پھر بڑے مزے سے ٹیپ آن کر کے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔



اگلے ڈیڑھ دو ماہ ہوا کی مانند اُڑ گئے۔ اُن دونوں کے درمیان ایک زبردست انڈر اسٹینڈنگ اور فرینڈ شپ ہو گئی' جو شاید عام دونوں میں ایک صدی بھی قائم نہ ہو سکتی تھی۔ ننھی منی سی معصوم پری کی مانند رانی یوں علی کے دل کے کسی خالی گوشے میں چھپ کر جم کر بیٹھی تھی کہ وہ بہانے بہانے دن میں ایک دو بار ضرور ہی اُسے دیکھنے ڈرائیونگ سکھانے چلے آتے۔ اُن کی اور رانی کی عمر میں بارہ تیرہ برس تو ضرور ہی حائل تھے اور بادی النظر میں وہ انتہائی سنجیدہ' متین' خاموش سی طبیعت اور باوقار شخصیت کے مالک لگتے تھے مگر اندر سے جیسے شریر' حاضر جواب' لطیفہ گو اور حس مزاح سے بھری ہوئی ہی جاتی تھی۔ اُن کی موجودگی میں رانی ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی اور وہ ہنسا ہنسا تے بیزار نہ ہوتے۔

ہنسی ہنسی میں وہ گاڑی جیسی مصیبت چلانا خوب سیکھ گئی۔ رفتہ رفتہ اپنے جلد نروس ہو جانے والے حواس پر کنٹرول کر کے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ تنہا گاڑی ڈرائیو کرنے اور کھلی سڑک پر چلانے کے لائق ہو گئی۔ لیکن یہ ساری مدت عجیب سرشاری اور سرخوشی کے انمول احساس کے ساتھ گزری۔

اس سلسلے میں علی کے مشورے اور اصرار پر اُس نے بہ طور خاص اپنی پرنسپل زیب النساء بیگم سے اجازت لے لی تھی۔ بعد میں علی بھی کالج میں ایک دن آ کر اُن سے ملاقات کر گئے تھے۔ بہ قول علی کے وہ اُن کی بہت قدردان بن گئی تھیں۔ ویسے انہوں نے اپنے طور پر کچھ خاص چھان بین کے بعد اور ضروری معلومات کے ساتھ علی کے اس اقدام کو سراہا تھا اور انہیں بہ خوشی رانی کو ڈرائیونگ سکھانے کی اجازت عنایت کی تھی۔ ان کے خیال میں علی قابلِ اعتبار شخص تھے اور یہ ذمہ داری کا کام بہ حسن و خوبی ادا کرنے کے پوری طرح اہل تھے۔ چناں چہ انہیں فون پر رابطہ قائم کر کے کالج ٹائم کے بعد رانی کو یہاں رہنے کی اماں بی سے اجازت دلوانا چنداں مشکل نہ لگا۔

دراصل صاحب زادی زیب النساء بیگم رانی کو اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز رکھتی تھیں اس لیے اُس کے شوق اور پھر اس مشغلے کی افادیت کے پیشِ نظر با آسانی رضا مند ہو گئی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے "قصرِ دیدار" کے عقبی ہموار میدان اور پھر پائیں باغ سے مصنوعی جھیل کے ساتھ ساتھ بل کھاتی سرمئی سڑک پر ڈرائیونگ سیکھنے کی اجازت دے دی تھی۔

رانی نے اپنے اس مشغل کا تذکرہ صاحب زادی افروز جہاں اور شاہ جہاں سے بھی کیا تھا۔ انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اکثر جب وہ جھیل کے کنارے کنارے علی سے گاڑی چلانا سیکھ رہی ہوتی تو وہ دونوں کہیں نہ کہیں اپنی جھلک دکھا جاتیں۔ اُس کی موجودہ مصروفیت کو اماں بی نے بھی اعتراض کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا اور شرمین تو بہت خوش اور مگن تھی۔ گھر میں ایک عدد گاڑی کے آ جانے کا خیال ہی بہت گدگدا دینے والا تھا۔

اسی ہلکی پھلکی مصروفیت اور حسین صبح و شام کے چکر میں تقریباً دو ماہ کی مدت تمام ہوئی اور علی کی کوششوں نے رانی کو ایک کارآمد ہنر سے بہرہ مند کر ڈالا اور رانی نے

پیسے کا جوڑ توڑ کر کے کسی نہ کسی صورت ایک عدد سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید ہی ڈالی۔

یہ قول علی سیکنڈ ہینڈ تھی۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ بظاہر انہوں نے کو ایک بیچ کی سیکنڈ ہینڈ گاڑی دکھلا کر اُس کی پسند پوچھی۔ تو اُس نے گولڈن کلر کیا اور علی نے ایک ہفتے کے بعد بڑے اعتماد کے ساتھ یہ سفید جھوٹ بول ڈالا۔

"تمہاری گاڑی گولڈن کروادی گئی ہے۔"

سیکنڈ ہینڈ کی آڑ میں انہوں نے قیمت اتنی کم اور بے ضرری بتائی تھی کہ را زیادہ مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ یوں بھی جب سے اُس نے سروس کی تھی اخراج کے لیے ابو کی طرف سے آنے والی رقم کا بہترین مصرف نکل آیا تھا۔

علی نے خیر خواہی کی حد کر ڈالی تھی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی کہ درحقیقت اندر ہی اندر انہوں نے کس طرح پیسے سے رانی کی مشکل حل کر ڈالی تھی۔ خود رانی فرشتوں تک کو اصل حقیقت کا احساس نہ ہو پایا۔ وہ اس خیال سے بے اندازہ خوش مگن تھی کہ یہ سب کچھ اُس کی اپنی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے۔ اپنی کوشش اور محنت کا ہی درِاصل انسان کی بے پایاں خوشیوں کا موجب ہوا کرتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ آج کل بہت خوش اور پُرسکون رہتی۔ بات بے بات ہنستی رہتی۔ اُسے یوں محسوس جیسے اپنی آج تک کی زندگی میں اب خوشی اور طمانیت کا احساس اُسے مخصوص کر ہو۔ خوشیوں اور مسرتوں کا اصلی مفہوم اُسے اب سمجھ میں آیا تھا۔ اُس کے بے پناہ اطمینان اور خوشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سواری کے معاملے وہ خود کفیل بھی ہو گئی تھی اور احسان مند بھی نہ ہونا پڑا تھا۔

علی کی احسان مندی بھی تھی کہ کبھی اُس کے سگے باپ نے بھی اُس کی تکلیف اور ہر روز بسوں میں دھکے کھانے کی پروا نہ کی تھی جب کہ علی نے سے اُس کا ساتھ دیا تھا اور اپنا قیمتی وقت بچا بچا کر اُسے ڈرائیونگ سکھائی تھی بلکہ

بھالی بھی انہوں نے تھی۔ ظاہر ہے یہ اُن کی نیک نیتی اور بے پناہ خلوص ہی تھا ورنہ انہیں ان لوگوں سے کسی طرح کا مطلب یا لالچ تو نہ تھا!

رانی کو ڈرائیونگ سکھا کر جس بے بہا خوشی اور سرشاری کا احساس علی کو ہوا تھا۔ یہ بھی اُن کا دل ہی جانتا تھا۔ انہیں ان تینوں ماں بیٹی سے کچھ قدرتی اُنس اور ہمدردی ہو چلی تھی۔ رانی کے ہر روز کالج آتے جاتے اور پڑھانے کو تو وہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے مگر بس میں آنا جانا اور گھنٹوں بس اسٹاپ پر بس کے انتظار میں کھڑے رہنا بہت معیوب اور تکلیف دہ لگتا تھا۔ اتفاق سے پہلی مرتبہ جب اُس نے ان سے لفٹ مانگی۔ تب بھی اسٹاپ پر پریشان کھڑی تھی اور دوسری دفعہ بارش نے نجلے پہ دہلا کر دیا تھا۔ اُس کی تکلیف کا احساس علی کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ یہ چھوٹی موٹی سی لڑکی پہلی نظر میں ان پر جانے کیا سحر کر گئی تھی۔ رہی سہی کسر اماں بی سے ملاقات کے بعد نکل گئی۔ انہوں نے تقریباً دنیا بھر کی سیاحت کر ڈالی تھی مگر ایسے بے ریا اور مکر و فریب سے آشنا لوگ کہیں نہ ملے تھے۔ شرمین کی معصومیت اور شوخیوں پر تو وہ دل و جان سے فدا تھے۔ انہی تمام احساسات نے مل جل کر انہیں ان تینوں ماں بیٹی سے بہت قریب کر دیا تھا اور وہ دل ہی دل میں ان تینوں کے لیے بڑے خوش آئند فیصلے کر چکے تھے۔

جس روز رانی کو ڈرائیونگ لائسنس ملا خوشی سے اُس کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ بے پایاں مسرتوں کے احساس سے اُس کا رواں رواں رقص کر رہا تھا۔ کالج ٹائم کے بعد وہ سیدھی افروز جہاں اور شاہ جہاں سے ملنے جا پہنچی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس کی خوشی میں سب سچے دل سے شریک تھے۔ ان دونوں نے خوب خوب مبارک باد اور شاباش وصول کی۔

جاتے جاڑوں کی یہ خوب صورت ذات بھی اُس کی مسرتوں میں شریک تھی۔ موسم ... وقت نہ گرم۔ فضائیں، ہوائیں سب اپنی اپنی سی لگ رہی تھیں، جیسے اپنائیت ...

لہجے میں سرگوشیاں کر رہی ہوں۔ "ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تم اکیلی نہیں ہو۔"

"قصرِ دیدار" سے نکل کر وہ بجلی اسپیڈ میں دائیں موڑ پر آئی تو سامنے سے علی ا
مرسیڈیز بھگائے چلے آ رہے تھے۔

"یہ آپ میرا لائسنس لیے کہاں گھوم رہے ہیں؟" رانی نے اُن کے برابر آ
شوخی سے دریافت کیا۔

"ابھی آخری ٹرائی باقی ہے محترمہ!" انہوں نے بڑے رعب سے جواب دیا۔

"کیوں؟ — کیا اب مجھے کوئی رشوت بھی دینی پڑے گی؟" رانی نے اُ
سوالیہ نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

"رشوت......؟" وہ دھیرے سے ہنسے۔ "رشوت تو خیر نہیں کہہ سکتیں آپ
ایک آخری آزمائش ضرور کہہ سکتی ہیں۔"

"واہ! یہ کوئی بات ہی نہ ہوئی۔" رانی چمک کر بولی۔ "کبھی ٹرائی کہتے ہیں
آزمائش۔ یہ کیوں نہیں صاف کہتے کہ آپ کو ابھی میرا بھروسا ہی نہیں ہے۔"

"ارے......رے...... ایسی بدگمانی بھی اچھی نہیں۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

"تھوڑا سا تمہارا امتحان مقصود ہے۔ اس کے بعد یہ لائسنس تمہارا۔ بس اتنی سی با
ہے۔ بیکار رونے بیٹھ گئیں۔"

"اللہ نہ کرے کہ میں روؤں۔" وہ کچھ برا مان گئی مگر مزید بگڑنا نہیں چاہ رہی
اس لیے صلح کے لہجے میں پوچھا۔ اچھا بتایئے کیا شرط ہے آپ کی؟"

"وہ...... سامنے نہر کا اونچا پل دیکھ رہی ہونا!" علی نے سامنے اشارہ کر
بتایا۔ "بس وہاں سے تین مرتبہ گاڑی لے چڑھو...... اور...... اترو لائسنس تمہیں
جائے گا...... اور یہ بھی......" انہوں نے کھڑکی کے شیشے کے پیچھے سے اُسے ا
ڈرائیونگ لائسنس اور کوڈ بک دکھائی۔

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

"واہ! یہ کیا شرط ہوئی۔" رانی منہ بنا کر بولی۔ "آپ کو تو آج مجھے شاباش دینی
چاہیے تھی اور مٹھائی کھلانی چاہیے تھی بلکہ اوندھی سیدھی شرطیں عاید کرنے لگے۔"

"پہلے تم یہ معمولی سی شرط تو پوری کرو۔" وہ اسے تاؤ دلانے والے انداز میں
بولے۔ "پھر ڈھیروں شاباش اور منوں مٹھائی کھالینا۔ ویسے اگر اس شرط سے ڈر لگ
رہا ہے تو پھر...... چھوڑ دیتے ہیں۔"

"جی نہیں۔" وہ حسبِ توقع لڑنے مرنے پر تیار ہوگئی۔ "میں اتنی بزدل اور
ڈرپوک نہیں ہوں کہ اتنی سی بات پر خوف زدہ ہو جاؤں۔"

اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ گاڑی کا رخ پل کی طرف موڑ لیا۔ علی کی ہنسی اور بھی
جلتی پر تیل کا کام کر گئی۔ حالاں کہ اندر سے اچھی طرح جانتی تھی کہ علی صرف اُسے ستا
کر لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اُن کا مقصد تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کے سوا کچھ نہیں ہے مگر
اس وقت اُسے اُن کی بات تیر کی طرح لگی اور وہ بگولے کی طرح اڑ گئی۔

گنگناتی نہر کے اوپر بنا ہوا یہ پل غیر معمولی اونچائی تک اٹھا ہوا تھا جس کی گہری
اترائی اور چڑھائی کے دونوں سمت شیشم اور برگد کے گھنے اور تناور درخت کھڑے
تھے۔ اُن سے کچھ فاصلے پر نواب فیملی کی لہلہاتی، سرسبز و شاداب اراضی میلوں تک پھیلی
ہوئی تھی۔ کھیتوں اور ہریالے باغات کے سلسلے کو اسی نہر سے نکلنے والی ننھی منی
گنگناتی ندیاں سیراب کرتی تھیں۔ مجموعی طور پر یہ مقام بہت ہی دل کش اور پرسکون
تھا۔

نہر کے کنارے کنارے چند عورتیں گھڑے سروں پر رکھے چلی جا رہی تھیں۔
آوارہ ہواؤں کے جھونکے اُن کی رنگ برنگی چنریاں اڑائے لیے جا رہے تھے۔ علی
اُن کی شرارت سے لطف اندوز ہونے کے لیے پل سے خاصے فاصلے پر نشیب میں
گاڑی روک کر کھڑے ہو گئے۔ دوپہر کا سناٹا ہونے کی وجہ سے کھیت کھلیان اور

گلیارے سنسان پڑے تھے۔ کبھی کبھار کوئی آتا جاتا دکھائی دے جاتا۔ رانی کی دوسری طرف سے پل بھر کے لیے بَیل کی انتہائی بلندی پر نمودار ہوئی اور بڑے اعتماد کے ساتھ علی کے قریب سے اُڑتی چلی گئی۔

انہوں نے ہاتھ ہلا کر شاباش دی۔

دوسرا راؤنڈ بھی بہ خیر و عافیت مکمل ہو گیا۔ رانی اُن کی طرف بالکل بھی متوجہ نہ تھی۔ بہ ظاہر یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ پوری طرح ڈرائیونگ میں منہمک ہو۔ تیسرے راؤنڈ پر جیسے ہی وہ پل کی چوٹی پر نمودار ہوئی علی کے حواس جیسے معطل ہو کر رہ گئے۔ دیر کے لیے اُن کا دل سینے میں دھڑکنا بھول گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی کا رُخ سڑک کے بجائے درختوں کے جھنڈ کی طرف ہو گیا۔ ونڈ اسکرین کے پار سے رانی کا دھواں چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ شاید وہ ان لمحات میں حواس کھو بیٹھی تھی ورنہ ہوش و حوصلے سے کام لیتی تو اس خطرناک سچوئیشن پر بروقت قابو پا سکتی تھی۔

یوں لگا جیسے علی کے جسم کا ہر عضو مفلوج ہو کر رہ گیا ہو۔ وہ چلّا کر اسے چاہتے تھے کوئی ہدایت دینا چاہتے تھے مگر حلق سے آواز ہی نہ نکل سکی۔

گاڑی ایک زوردار آواز کے ساتھ شیشم کے درخت سے ٹکرا کر رُک گئی۔

سناٹے میں یہ آواز دُور دُور تک پھیل گئی۔

علی اپنی گاڑی سے بے قرار روح کی طرح نکل کر دوڑتے چلے گئے۔ پیشانی سے خون کی گرم گرم دھاریں بہہ رہی تھیں۔ اُس کا آخری احساس یہ تھا اُس پر جھکے بے تابی سے پکارے جا رہا تھا پھر اس کا دماغ عمیق گہرائیوں میں چلا گیا۔

چند لمحوں کے اندر اندر وہ ہوش و حواس سے بے نیاز ہوتی چلی گئی۔

♥.......♥.......♥

اس سانحے کو گزرے کتنے دن بیت گئے تھے' کتنے گھنٹے ہوئے تھے یا پھر وقت ...گھڑیاں آگے جا پہنچا تھا' رانی اس امر سے بے خبر رہی۔ وہ کہاں ہے! اُسے کیا ہوا ...اُس کے لیے کون کتنا پریشان ہوا اور اُس کے ساتھ کیا کیا گزری؟ وہ ان تمام ...ں سے بے نیاز و غافل تھی۔ لمحہ بھر کے لیے اُس کی آنکھ کھلی تو عجب بجھ میں نہ آنے ...صورت حال دکھائی دی تھی اُسے۔ اُس کا اپنا گھر تو نہیں تھا وہ! کسی کی بیش قیمت ...سامان اور لوازمات سے سجی سجائی خواب گاہ تھی وہ۔ اُس کی کلائی کی رگ میں ...سوئی کی نوک بری طرح چبھ رہی تھی۔ معاً اُس کی نگاہ گھومتی ہوئی سامنے ایک ...لا پر جم کر رہ گئی۔ جہاں علی نیم دراز تھے اور ان کی پشت پر شاید وہ صاحب زادی ...جہاں ہی تھی جو علی کی گردن میں بازو ڈالے اُن پر جھکی کچھ کہہ رہی تھی اور علی ...ل سے سن رہے تھے۔

...پل کے پل یہ تصویر اُس کے سامنے آئی۔ اُس نے اُن کو آواز دینے کے لیے ...جان کی پوری قوت صرف کر ڈالی مگر آپس میں خشکی سے جڑے ہوئے لب کھل ...سکے' پکار اندر کی اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔ ذرا سی دیر میں دوبارہ اندھیروں میں ...گئی۔

اگلی بار ہوش آنے پر اُس نے خود کو اپنے کمرے کے جانے پہچانے ماحول میں پایا۔

بہت دیر سے اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کانوں میں بڑے زور و شور سے سیٹیاں بج رہی ہوں یا پھر وہ کسی بہت بڑے ریلوے اسٹیشن پر کھڑی ہے اور انجن سیٹیاں بجاتے شور کرتے گڑ گڑ کرتے گزر رہے ہوں۔ رفتہ رفتہ وہ تیز گڑگڑاہٹ عجیب بے ہنگم شور میں بدل گئی۔ شاید بہت سارے مسافر آپس میں جھگڑنے میں مصروف ہو گئے تھے جو غالباً پولیس کے آ جانے کی وجہ سے چُپ گئے اور بالآخر اُن کی چیخ و پکار مکھیوں کی ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ میں تبدیل ہوتی اور...... رفتہ رفتہ یہ بھنبھناہٹ بھی ختم ہوتے ہوتے بالکل تھم گئی۔

اُس نے گویا کسی بھیانک ــــ اور...... طویل خواب کی بھول بھلیوں سے آ کر ایک لمبی جھرجھری لی اور آنکھیں کھول دیں۔

اُسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر شرمین چیخ کر اُس سے لپٹ گئی۔ عجیب نہ چھو لینے والا سماں تھا وہ بھی! اماں بی کی سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان اُسے مانوسیت اور اطمینان کا بے پایاں احساس ہوا۔

گزرا ہوا واقعہ ذہن میں پوری طرح اُجاگر ہونے لگا تاہم مجموعی کیفیت سوئی سوئی سی لگ رہی تھی۔ ہاتھ پیر ہلانے جلانے کو جی چاہ رہا تھا نہ بولنے کو۔ لگ رہا تھا جیسے اپنے تمام احساسات اور خیالات سمیت کسی خول کے اندر بند ہو۔

"شمی چاند! تم کچن میں چلی جاؤ اور اپنی آپی کے لئے سُوپ گرم کر لاؤ۔ میں دو نفل شکرانے کے پڑھ لوں۔"

اماں نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں شرمین کو ہدایت کی اور خود جلدی سے وضو کرنے چل دیں۔

شرمین نے بڑی محبت اور عقیدت کے احساس سے مغلوب ہو کر بہن کی پیشانی کو بوسہ دیا پھر آنکھیں پونچھتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ رانی نے دونوں پر ایک مسکراتی نظر ڈالی اور خود کو زندہ سلامت پا کر پُرسکون انداز میں دوبارہ آنکھیں مُوند لیں مگر فوراً ہی اُسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ کسی نے اس کا ہاتھ پہلو سے اُٹھا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا تھا۔

"ارے...... آپ!" اُس کے منہ سے مدھم سی چیخ نکل گئی۔

علی کی سرخ سرخ آنکھیں اور سُتا ہوا چہرہ دیکھ کر شروع سے آخر تک تمام واقعات اُسے از سرِ نو یاد آتے چلے گئے۔ ساتھ ہی وہ جاگتے لمحے کا عجیب و غریب منظر چشمِ تصور میں لہرا گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ سب اُس نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا یا سوتے ہوئے بیمار ذہن کی کرشمہ سازی تھی! محض کوئی خیالی تصویر یا پھر سچ مچ کی حقیقت تھی وہ فیصلہ نہ کر پائی کہ اُس نے سنا۔ علی مبہم لہجے میں بڑی بے تابی سے پوچھ رہے تھے۔

"اب...... تم کیسا محسوس کر رہی ہو رانی!"

"اچھی ہوں۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"شکر ہے خدایا۔" علی نے طمانیت کا ایک گہرا سانس کھینچا اور بیڈ کے پاس سے ہٹ کر کرسی پر جا بیٹھے۔

رانی کے پوری طرح ہوش میں آتے ہی پورے گھر میں جیسے خوشی اور سکون کی ایک لہر سی گھوم گئی تھی۔ ماسی مریاں جسے اماں بی نے اب مستقل اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا دوڑی دوڑی آئی اور چٹاچٹ بلائیں لے کر ڈھیروں دعائیں دینے لگی۔ پھر جلدی سے کئی مرچیں، لہسن، پیاز کے چھلکے اور جانے کیا کیا اٹھا لائیں اور منہ ہی منہ میں کچھ

پڑھتے ہوئے اُس کی نظر اُتارنے لگی۔

علی مسکرا مسکرا کر ساری کارروائی دیکھتے رہے۔ رانی نے تھک ہار کر پھر آنکھیں بند کر لی تھیں مگر آج اُسے خاموشی سے لیٹے رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہر کوئی باتیں کرنے کا حتمی تک رہا تھا۔ شرمین چھوٹی سی ٹرے میں سوپ کا پیالہ اور چمچ لیے آ موجود ہوئی۔ اُس کا شانہ ہلا کر کہنے لگی۔

"بھئی آپی اب پڑے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ بس اُٹھ بیٹھیے۔ بہت ہو گئی ڈاکٹرز کی پوری ٹیم نے آپ کو نارمل اور صحت مند قرار دے دیا ہے۔"

رانی کے خشک لبوں پر ایک بے ساختہ سی مسکراہٹ ناچ گئی۔ علی کے اشارے سے شرمین نے پھر اصرار کیا۔

"پتا ہے اب آپ کے تیمارداروں کے آرام کا وقت آ گیا ہے۔ علی بھائی چار دن سے تو ایک لمحہ بھی نہیں سوئے۔"

"اور... شرط بھی تو انہی بے چاروں نے پیش کی تھی!" رانی نے آنکھیں کھول کر جیت سے یاد دہانی کرائی لیکن فوراً ہی شرمندہ ہو گئی۔ علی کے چہرے پر اُسے اتنے شدید گہرے اور واضح دکھ اور تاسف کے تاثرات گڈمڈ نظر آئے کہ اپنا جملہ بہت چھوٹا سا اور بے محل معلوم ہوا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا زبان سے نکلی بات اور کمان سے نکلا تیر ناقابلِ واپسی ہوتا ہے۔ یہی مرحلہ یہاں بھی درپیش تھا۔

"آئی ایم سوری... ویری سوری۔" علی گردن کو خم دے کر بڑی نڈھال سی آواز میں بولے۔ "بلکہ 'سوری' تو بہت ہی چھوٹا سا ننھا سا لفظ ہے۔ بندہ ہر سزا اور ہر ملامت کے لیے درخواست گزار ہے۔"

رانی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اُس نے زبان سے کوئی بات کیے بغیر شرمین کی طرف رُخ پھیر لیا اور آہستہ آہستہ سوپ پینے لگی۔

"ایسے تو مت کہیے علی بھائی!" شرمین سے رہا نہ گیا۔ وہ درمیان میں بول پڑی۔

"اگر سچ کہا جائے تو آپی کی بے ہوشی سے سب سے زیادہ آپ ہی پریشان رہے اور دن رات جاگ جاگ کر تیمارداری بھی کرتے رہے۔ مجھے اور اماں کو تسلی بھی دیتے رہے۔ آپ کے حوصلہ دلاتے رہنے سے تو ہمیں بھی سہارا رہا ورنہ خبر نہیں کیا ہوتا!"

"سب کیا دھرا بھی تو میرا ہی ہے بچے!" علی نے اُسی موڈ کے تحت جواب دیا۔ "اگر میں پُل سے اُترنے چڑھنے کی شرط عاید نہ کرتا اور یوں ہی اُن کا لائسنس دے دیتا تو یہ نوبت ہی کیوں آتی؟"

"اب جانے بھی دیجیے علی بھائی!" شرمین نے پھر رانی کی طرف دیکھ کر بڑی فراخ دلی سے جواب دیا۔ "قسمت میں ایسا لکھا تھا تو ہو گیا ورنہ آپ نے تو پوری طرح آپی کو ڈرائیونگ سکھا دی تھی۔ آپی تو خود ہر وقت آپ کی تعریف کرتی تھیں۔"

"ہیں بھئی! یہ سچ ہے کیا؟" علی نے یقین نہ آنے والے انداز سے رانی کی طرف دیکھا۔ "میں نے تو سمجھا تھا مجھے بُرا بھلا کہنے کے سوا آپ کو کوئی کام ہی نہیں ہے۔"

رانی نے اِس دفعہ بھی خاموشی میں عافیت سمجھی۔

دراصل اس کی طبیعت ابھی تک پوری طرح سیٹ نہیں تھی۔ دماغ اور جسم میں سنسناہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی وقت اماں بی شکرانے کے نفل ادا کر کے کمرے میں واپس آ گئیں اور رانی کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

باتوں کا موضوع بدل گیا اور علی نے چُپ سادھ لی۔



اگلے دن شام میں علی نے پھر چکر لگایا۔

سفید کاٹن کے کلف دار شلوار سوٹ میں بہت فریش اور تر و تازہ لگ رہے تھے۔ رانی نے جی بھر کے انہیں دیکھا۔ ساتھ ہی یوں لگا جیسے اندر کوئی مدھم سا چھناکا ہوا ہو۔ آج اس کی طبیعت کل کی نسبت بہت سنبھلی ہوئی تھی۔ علی کی صورت دیکھتے ہی اسے صاحب زادی افروز جہاں کا ان کی گردن میں بانہیں ڈالنا یاد آ گیا۔ اس نے ایک جھرجھری سی لے کر اپنا دھیان ہٹانا چاہا اور ادھر اُدھر کی سوچنے لگی۔

اماں بی کسی کام سے اٹھیں تو اس نے علی سے پوچھا۔ "ہم تو اب بہتر ہے۔ آپ سنائیے کیسی گزری آپ پر!"

"اوہ...... کچھ مت پوچھو کیسی گزری!" وہ ایک دبا ہوا گہرا سانس کھینچ کر سیدھے ہو بیٹھے۔ "کوئی پریشانی سی پریشانی تھی! اف میرے خدا! سچ کہتا ہوں میں اپنی زندگی میں کبھی ایسا پریشان نہیں ہوا۔"

"تو گویا میں نے آپ کو بدحواس کر دیا۔" رانی نے پھیکی سی مسکراہٹ سے پوچھا۔

"ہاں...... بلاشبہ۔" انہوں نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔

"معلوم ہے تم ایک نہ دو پورے اڑتالیس گھنٹے بے ہوش رہی تھیں! پورے اڑتالیس گھنٹے۔" انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "اور ان خوں خوار اڑتالیس گھنٹوں کے صبر آزما اڑتالیس کروڑ لمحات! بس یوں جانو لمحہ لمحہ سولی پر کٹا۔ تمہیں مسلسل خون اور گلوکوز کی بوتلیں دی گئیں۔"

تھوڑی دیر خاموش رہ کر پھر بولے۔ "سب سے گہرا اور مہلک زخم تمہیں پیشانی پر آیا تھا جو ڈیش بورڈ سے ٹکرائی تھی۔"

رانی کا ہاتھ بے اختیار سر پر بندھی پٹی کی طرف گیا۔ پھر وہ اپنی کلائیوں کی طرف دیکھنے لگی، جن میں کانچ کی چوڑیاں چبھ گئی تھیں۔ علی اس کا مطلب سمجھ گئے۔ جلدی سے بتایا۔

"اور...... یہ تمہاری دونوں کلائیاں اسٹیرنگ کے درمیان بُری طرح پھنس چکی تھیں جنہیں "زندہ و سلامت" نکالنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔"

"پھنسی رہنے دی ہوتیں اسٹیرنگ ہی میں!" رانی نے تجاہل عارفانہ برتا۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔"

"کیوں؟" وہ اب تک بہ ضد تھی۔

"وہ یوں کہ اماں بی مجھے مار ڈالتیں۔"

دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے لیکن وہ ہنستے ہی چپ ہو گئی۔ علی نے اس کی کیفیت پر غور نہیں کیا۔ جلتی ہوئی سگریٹ انہوں نے ایش ٹرے میں بجھائی۔ سنجیدگی سے بولے۔ "خدانخواستہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں اپنے آپ کو ہرگز معاف نہ کرتا۔ وہ تو شکر ہے تم نے زندہ بچ کر مجھے بچا لیا۔"

"کیوں؟" رانی ایک ابرو چڑھا کر بولی۔ "میرے بچ نکلنے سے آپ کے بچ جانے کا کیا تعلق؟"

"ہے!..... بہت بڑا تعلق ہے۔" وہ عجیب سی کیفیت کے تحت بولتے چلے گئے
"دیکھو نا، پُل والی شرط تو میری ہی عاید کردہ تھی۔ بخدا تم نے زندہ رہ کر میرے لواحقین
پر ایک احسان عظیم کر ڈالا ورنہ میں نے وہیں پُل کے قریب ایک شان دار تاج
تمہارے لیے اور ایک کچا مزار اپنے لیے بنوانے کا نقشہ بھی دے دیا تھا ماہر تعمیرات
کو....."

"اچھا..... تو آپ کے کوئی "لواحقین" بھی ہوتے ہیں؟ مگر آپ نے آج تک
ہم سے تو تعارف کروانا تک پسند نہیں کیا۔" رانی نے ان کی بات پکڑ کر گلہ کیا۔
"تعارف کیا!" وہ لہک کر کہنے لگے۔ "آپ کی باقاعدہ ملاقات کرائیں گے
عنقریب۔ آپ ذرا جلد از جلد اس "بستر" سے تو نجات حاصل کریں۔"
"اور..... ہاں میری گاڑی؟" رانی نے اچانک پوچھ لیا۔
"اوہ ظالم لڑکی۔" وہ اچھل کر بولے۔
"اس کا تم نے کچومر ہی نکال ڈالا تھا۔ ریپیر کے لیے جمع کرا دی ہے۔ وہ
اچھا ہو گیا کہ ایکسیڈنٹ سے قبل ہی لائسنس مل چکا تھا ورنہ ایک نئی قسم کی دشواری سے
سامنا ہوتا۔"

اس دن وہ جاتے جاتے اسے لائسنس اور کوڈ بک دے گئے تھے۔
ان کے جانے کے بعد اماں بی اور شرمین نے اسے بتایا کہ جائے حادثہ سے
قریب ترین مقام "قصرِ دیدار" ہی تھا۔ یہ حالتِ مجبوری زیب النسا بیگم کی اجازت
علی اُسے وہیں اٹھا لے گئے تھے۔ اُسے بے ہوش پا کر وہ فوراً حرکت میں آ گئی تھیں ا
ایک گھنٹے کے اندر اندر بہترین ڈاکٹرز اور نرسیں بلوا کر ہنگامی طور پر چھوٹے سے
ہاسپٹل کا ساماں پیدا کر ڈالا تھا اور پوری تندہی سے اُسے بچا لینے کی سر توڑ کوشش کروا
تھی۔ جب تک اُس کی حالت خطرے سے باہر نہ ہو گئی زیب النسا بیگم نے خود پر غ

گویا حرام کر لی تھی جب سے اسے اماں بی کے حوالے کیا تھا ہر گھنٹے دو گھنٹے کے بعد
فون پر اس کی خیریت معلوم کرتی رہتی تھیں۔ یہی حال افروز جہاں اور شاہ جہاں کا
تھا۔ ان سب لوگوں کی فکر مندی اور خیر خواہی کا یہ عالم تھا کہ اس دوران کے تمام
اخراجات اپنے ذمے لے لیے تھے۔ سننے میں یہی آیا تھا کہ اس معاملے میں زیب
النسا بیگم نے علی کی بھی ایک نہ سنی تھی اور اُن کی یہ دلیل صاف رد کر دی تھی کہ رانی کو
ایکسیڈنٹ چوں کہ ان ہی کے لاابالی پن کی وجہ سے پیش آیا اس لیے تمام ہرجانہ بھی
علی خود برداشت کریں گے۔ یہ تمام تفصیلات جاننے کے بعد رانی دیر تک خاموش لیٹی
ساری باتوں پر غور کرتی رہی۔

علی درحقیقت کون ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟ اُن کا پس منظر کیا ہے؟ یہ تمام سوالات
روزِ اوّل کی طرح جب اُن کی پہلی ملاقات ہوئی تھی ہنوز جوں کے توں پردے میں تھے۔
ان سوالات کے جوابات پوشیدہ رکھنے میں بہ ظاہر کسی کی کوشش کو دخل بھی معلوم نہ ہوتا تھا
بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نقاب کشائی کی کسی کو کبھی ضرورت ہی محسوس نہ
ہوئی تھی۔ اماں بی بہت ہی سیدھی سادی سی گھریلو ٹائپ خاتون تھیں۔ شرمین کو ان باتوں
سے کوئی مطلب ہی نہ تھا۔ رہ گئی خود رانی! تو اُسے علی سے شناسائی کی حدود میں بے تکلفی
کے بعد علاوہ ڈرائیونگ سیکھنے کے دوسرا کوئی خیال ہی نہ آیا کبھی۔

ہاں! اب ذہن کے پردے پر ضرور رہ رہ کر جیسے بجلی کا ایک کوندا سا لپک رہا تھا۔ وہ
گھنٹوں صاحب زادی افروز جہاں اور علی کے درمیان کوئی کڑی یا چور راستا تلاش کرتی
رہی مگر اس دقیق مسئلے کا حل نظر نہ آ سکا۔ بہ ظاہر تو علی اور نواب فیملی کے درمیان اک ذرا
سا بھی ربط دکھائی نہ دیتا تھا۔

کتنے دن تک رانی خود وہیں "قصرِ دیدار" کے مضافات میں علی سے ڈرائیونگ
سیکھتی رہی تھی۔ جب تک تو کوئی قدرِ مشترک نظر نہ آئی تھی بلکہ اگر دیکھا جائے تو زیب

النسا بیگم سے علی کا پہلا تعارف بھی رانی کی وجہ سے تھا' ورنہ جہاں تک رانی کی معلومات تھیں' وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے اور پھر بعد میں بھی یہ تعلق صرف ان دو کے درمیان ہی رہا۔ نواب فیملی تک تو رانی کے خیال میں علی کی رسائی ہرگز نہ تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ دوران بے ہوشی' حادثے کے فوراً بعد وہ اُسے "قصرِ دیدار" ہی اٹھا کر لے گئے تھے۔ تو کیا .... !!جو کچھ اس نے عالمِ غنودگی میں دیکھا، ایک حقیقت تھی!! صاحب زادی افروز جہاں اور علی کے درمیان کوئی رشتہ اُس کی بے ہوشی کے اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اندر قائم ہو چکا تھا!!

اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر وہی منظر گھوم گیا وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ ہزار بے تکلفی اور انڈر اسٹینڈنگ ہونے کے باوجود وہ علی سے کھل کر پوچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ ممکن تھا وہ بُرا مان جائے!! آخر ان دونوں کے درمیان ایک مختصر سے عرصے کی دوستی ہی تو تھی' جس کے بل بوتے پر وہ اتنی جرأت نہیں کر سکتی تھی کہ ان کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرنے بیٹھ جاتی۔ لیکن جانے کیوں! دل ہی دل میں کھٹکنے والی ایک بے نام سی خلش جی کو بھلی بھی نہیں لگ رہی تھی۔ کوئی چبھن' کوئی کھٹک تھی ضرور۔ یوں جیسے جو کچھ اس نے دیکھا تھا نہ دیکھا تو اچھا تھا یا پھر ...... جو کچھ دیکھا تھا' کاش! وہ سوئے ہوئے ذہن کی کرشمہ سازی ہوتی محض ایک خواب ہوتا! ایک خیال ...... ایک وہم ہوتا!! اگر یہ خیال ذہن سے نکلے نہیں نکل رہا تھا۔

شام کو ہی علی اتنی ڈھیروں باتیں کر گئے تھے' مگر آج ہمیشہ والی بات نہ لگی تھی یا نہیں اس کی اپنی سوچ تھی یا حقیقت؟ پوری طرح کوئی ایک بات پتا نہ چل رہی تھی۔ اتنی مدت میں جس حد تک وہ زیب النساء بیگم اور ان کے خاندان کے بارے میں جان پائی تھی' ان معلومات کی روشنی میں کم از کم وہ تو ایک ہزار سال تک بھی کسی

دستوری پر یقین کرنے کے لائق نہیں تھی لیکن علی' انھوں نے جو کچھ تھا وہ بھی تاقابل ..... دیا تھا۔

اس کے الجھے رہنے کا سب سے بڑا سبب نواب فیملی کی روایات تھیں اگر علی کے ارادے ان لوگوں سے بہت پہلے کی ہوتے یا پھر رانی نے ان کو بھی "قصرِ دیدار" میں آتے جاتے دیکھا ہوتا' تو پھر وہ اس حیرت انگیز منظر پر اس درجہ حیران بھی نہ ہوتی کیوں کہ ظاہر ہے کہ انسانی جذبات اور احساسات کو کسی بھی پیمانے سے ناپا تو نہیں جا سکتا لیکن حیران کن بات تو یہی تھی کہ علی کی شناسائی پرنسپل صاحب سے خود رانی کے طفیل ہی ہوئی تھی۔

آج کل اسے سوچنے اور غور کرنے رہنے کا وقت خوب وافر ملا ہوا تھا۔ کیوں کہ کالج سے اسے ایک ماہ کی چھٹی آرام کرنے کے لیے خود بہ خود دے دی گئی تھی۔ گاہے بگاہے افروز جہاں اور شاہ جہاں سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم رہتا۔ دونوں اس سے خوب طویل طویل گفتگو کرتیں۔ ہنسی مذاق میں کئی منٹ ضائع ہو جاتے یہ رابطہ منقطع ہوتا تو رانی سوچوں کے گرداب سے نکلنے کے لیے ریکارڈ پلیئر لے کر بیٹھ جاتی اور زیادہ تر اپنا پسندیدہ گیت۔

"مینوں ہے یاراں تے نال کنڈاں ٹپ کے
آواں گی ہوا بن کے۔"

سنتی رہتی۔ ساسی مریاں نے پورے نغمے کی اتنی پُر تفصیل ترجمانی اُردو میں کی تھی کہ اب رانی کے ساتھ ساتھ شرمین بھی اس کے ساتھی شامل ہو جاتی اور دونوں بہنیں گئی بار پلٹ پلٹ کر یہی گیت سنے جاتیں۔ اماں بی سارا دن اپنی سٹریچر میں الجھی رہتیں۔



For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

دن یونہی بے کیف سوچوں کی نذر ہوتے گئے۔ رات کو اکثر دونوں پچھلی طرف کے سامنے والے پارک تک چکر لگانے کے بعد کچھ دیر سنسان سڑک پر ٹہلتیں۔ جب رات زیادہ گہری اور ویران ہو جاتی اور اوپر کھلی چھت پر آ جاتیں اور جب ٹہل ٹہل کر تھک جاتیں تو کسی خالی گوشے میں بیٹھ کر ڈھیروں باتوں میں مصروف ہو جاتیں۔

پھر کسی لمحے میں خاموشی کو توڑتی ہوئی ماسی مریاں کی آواز دونوں کو چونکا جاتی

"لو کیو! کھانے سے بھی غافل ہو گئیں کیا آج! چلو نیچے اترو آدھی رات گئی..... چلی ہیں چھت پر گھومنے؟"

دونوں ہنستی ہوئی ایک دوسری کے پیچھے دھم دھم زینے اترتی نیچے آ تیں سیدھی باورچی خانے میں چوکی پر آ بیٹھتیں۔ ماسی مریاں ڈانٹتی جاتیں، کھانا گرم کرتی جاتیں۔

اماں بی عشا کی نماز اور وظیفے سے فارغ ہو کر کب کی سو گئی ہوتیں۔ ماسی مریاں کے واپس آ جانے سے انہیں بہت ڈھارس اور آرام ہو گیا تھا۔ گھر کی تنہائی میں مریاں کا دم غنیمت لگتا تھا۔ سارا دن اور رات کے ہر حصے میں گھر کے کسی نہ کسی کونے سے ان کی کھانسی یا باتوں کی آواز ابھر ابھر کر ان کی موجودگی کا پتا دیتی رہتی۔ شرمین

انہیں چھیڑ کر ستا کر خوب خوش ہوتی۔ گھر میں کوئی دوسرا تو اس کا ہم عمر تھا نہیں اماں بی تو ہر بات میں جھڑک دیتیں، رانی اس کی شرارتوں اور نادانیوں پر کبھی جنس دیتی، کبھی ایک آدھ دھپ لگا دیتی اب لے دے کے ماسی مریاں رہ جاتی تھیں جن سے وہ ہر طرح کا لاڈ بھی کر لیتی، ناز بھی اٹھوا لیتی اور ان سے دل لگی کر کے اپنا جی بھی خوش کر لیتی۔ انہیں بھی جب دیکھو اپنی عینک سنبھال سنبھال کر کبھی اسے رنگ برنگے کپڑوں کی کترنوں سے گڑیاں سی کر دے رہی ہیں یا انہیں کپڑوں پر سلائی اور کڑھائی سکھانے لگتیں۔ کبھی کبھی تو اماں بی کو بھی ہنسی آ جاتی جب وہ بڑے ارمانوں اور چاؤ سے چکنی پکی مٹی گوندھتیں اور ننھے ننھے برتن اور چڑیاں طوطے بنا بنا کر دھوپ میں سکھاتیں اور شرمین گھنٹوں ان کے ساتھ ساتھ لگی رہتی اور ان کی تمام سرگرمیوں میں خود ان کا ہاتھ بٹایا کرتی۔

ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر اماں بی اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھیں۔ رانی کو بھی دوپہر میں نیند آتی ہی نہیں تھی، کہاں بھلا فرصت اور چھٹی کے دنوں میں نیند۔ اس مسلسل آرام سے تو اب اس کا جی اوبھ سا گیا تھا اور وہ بڑی سنجیدگی سے کالج دوبارہ جوائن کرنے کا ارادہ کر رہی تھی۔

اس وقت بند کمرے میں طبیعت الجھی تو ایک کتاب اٹھا کر لان میں چلی آئی تھی اور یہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

املتاس کے درختوں تلے گھنی چھاؤں میں ماسی مریاں اور شرمین بہت ساری گیلی مٹی کا ڈھیر لیے قسم قسم کے کھلونے بنا رہی تھیں لیکن کچھ سوچ کر اس نے دونوں کو ٹوکا اور نہ ان کے مشغلے میں دخل دیا بلکہ خود بھی ایک لان چیئر پر جا بیٹھی۔

کھلونے بنانے بگاڑنے کے دوران شرمین کی زبان برابر چلے جا رہی تھی۔ جانے کہاں کہاں کی ہانک رہی تھی۔ بیچ بیچ ماسی مریاں کے قصے کہانیاں جاری وساری

تھیں۔

اچانک ان تینوں کے درمیان علی آ دھمکے۔ گاڑی برآمدے کی سیڑھیوں پاس کھڑی کر کے وہ تیر کی طرح ادھر ہی چلے آئے۔ اُن کو دیکھتے ہی شرمین نے ایک بھرپور نعرہ لگایا اور مٹی میں لت پت ہاتھ لیے اُن کی طرف لپکی۔

"علی بھائی! دیکھئے میں نے کیسے خوب صورت خوب صورت کھلونے بنا... ہیں۔ پتا ہے یہ سب مجھے ماسی مریاں نے سکھایا ہے!"

"بہت گندی بچی!" علی نے اُسے زور سے پچکارا۔ "یہ مٹی میں ہاتھ دیئے ہے اور پروفیسر صاحبہ کو تو ملاحظہ فرمائیے اپنے خیالات سے ہی فرصت نہیں کہ... کریں۔"

"آپ آ تو گئے منع کرنے!" رانی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "جو آپ نہیں وہ تو نہیں ہو سکتی نا! اب دیکھنا یہ ہے کہ شرمین پر آپ کے کہے کا کیا اثر ہوتا ہے؟"

شرمین نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بھاگتی ہوئی گئی اور تیز تیز ہینڈ پمپ چلا کر ہاتھ پا... دھو کر واپس آ گئی اور آنکھیں مٹکا کر بولی۔ "علی بھائی کے کہے کا یہ اثر ہوتا ہے۔"

"ماسی مریاں بھی ہاتھ پونچھتی ہوئی ان دونوں کے قریب آ بیٹھیں۔ "حرفوں بنی ہوئی ہے حرفوں کی۔" سب ہنسنے لگے۔

"ماسی مریاں کے ریمارکس ہوتے خوب ہیں مزے دار۔"

رانی نے ہنستے ہنستے ماسی مریاں کی طرف دیکھا جو اَب کسی دوسرے کام کے جانے سے اپنی کوٹھری کی طرف چل دی تھیں۔ علی نے نیچی آواز میں کہا تا کہ وہ سن... سکیں۔

رانی نے انہیں بغور دیکھ کر پوچھا۔

"مزے دار سے کیا مراد ہے آپ کی؟ وہ بھی کوئی اچار چٹنی یا کھانے پینے کی

نہیں بھلا!"

اُس کے انداز پر علی زور سے ہنس پڑے۔ شرارت سے جواب دیا۔ "کھانے پینے کے متعلق تو کچھ عرض کرنے کی پوزیشن نہیں البتہ دیکھنے میں "زبردست" اور "آفت" چیز ہیں۔"

علی نے صاف طور پر اُن کے خوب صورت تیکھے تیکھے نقوش اور جھلکتی ہوئی سرخ و سپید رنگت کی طرف توجہ دلائی تھی۔ رانی نے فوراً بات پکڑی۔ "اس کا تو مطلب یہ ہے کہ آپ خواتین کو بڑے غور و خوض اور توجہ سے ملاحظہ فرماتے ہیں!"

"اور کسی "خاتون" پر غور کروں نہ کروں۔" علی نے برجستہ جواب دیا۔ "ماسی مریاں کے رنگ روپ پر ضرور غور کرتا ہوں۔"

"کیوں جناب کیوں!" رانی تیز ہو کر بولی۔ "اُن کے رنگ و روپ پر غور کرنے کی ہمت کس طرح ہوتی ہے آپ کو! صرف اس لیے تا کہ وہ بے چاری اکیلی لاوارث ہیں؟"

"ارے توبہ...... توبہ...... معاذ اللہ۔" علی کرسی سے اُچھل پڑے۔ ایک کان کی لَو چھو کر جلدی سے بولے۔

"آپ تو بھئی بہت خطرناک ہیں۔ میں تو کسی دوسرے نظریے سے کہہ رہا تھا۔ آپ نا معلوم کیا سمجھ بیٹھیں...... لاحول ولا قوۃ۔ میری تو والدہ مرحومہ سے بھی زیادہ لگ ہیں۔" پھر لمحہ بھر رُک کر شرارت کے لہجے میں کہنے لگے۔ "اور وہ...... لاوارث کس طرح ہو گئیں؟ آپ کے ہوتے ہوئے...... اُن کے تو خیر سے تین تین وارث یعنی آپ شرمین...... اماں بی۔"

رانی نے ایک گہری سانس لی اور تاسف سے بولی۔ "اُن بے چاری کا دنیا میں کون! نہ باپ...... نہ شوہر...... نہ کوئی بیٹا! بے چاری اکیلی بے بس اور تن تنہا

عورت!

"خیر..... جانے دیجئے۔" علی اُس کا موڈ بدلنے کو کہا۔ "یہ تو آپ بہر حال تسلیم کریں گی کہ ہیں وہ بہت خوب صورت اور حسین خاتون۔"

"اس میں کیا شک ہے!" رانی نے اُسی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"مگر یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ جیسی خوب صورت اور حسین وہ خود ہیں ویسے اُن کے نصیب ایسے ہرگز نہیں ہیں۔"

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں؟" علی مکمل طور پر بحث کے موڈ میں آ گئے۔ رانی کے جواب دینے کے لیے منہ کھولا مگر ماسی مریاں کو آتے دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی۔ اُن کے پیچھے پیچھے شرمین چائے کی ٹرے اور کھانے پینے کی چیزیں لیے دوڑی چلی آ رہی تھی۔ قریب آ کر ٹرے اُس نے میز پر رکھی اور تیز آواز میں بولی! "میں ڈر رہی تھی کہیں آپ واپس ہی نہ چلے گئے ہوں۔ ماسی نے چائے بھی اتنی دیر سے بنائی اور مجھے بھی کچن میں روکے رکھا۔"

ماسی مریاں جو میز سے پرے بیٹھی ہانپ رہی تھیں، کہنے لگیں۔ "ارے بیٹا! اگر تم آ جاتیں تو مجھے بڑھیا سے یہ سامان اُٹھایا جاتا!" کوئی ان کی بات کا جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ شرمین پھر بول پڑی۔

"علی بھائی! جلدی جلدی چائے پی لیجئے پھر میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں گی۔ آپ حیران رہ جائیں گے۔"

"شرمین!" رانی نے اُسے ٹوکا۔

"کسی وقت نچلی بھی بیٹھ جایا کرو۔ ابھی کسی نے چائے کو ہاتھ تک لگایا نہیں اور تمہاری فرمائشیں شروع ہو گئیں۔"

"ارے جانے دیجئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" علی نے ہاتھ ہلا کر

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

کہا۔ پھر شرمین کو تسلی دی۔ "ہاں ہاں بچے! ابھی دیکھتے ہیں ابھی۔" شرمین ایکدم دوبارہ خوش ہو گئی۔

چائے کے دوران زیادہ تر ماسی مریاں ہی بولتی اور اپنے ہاتھ سے بنی ہوئی چیزیں علی کو خوش ہو ہو کر کھلاتی رہیں جب کہ علی خوش ہونے اور تعریف کرنے میں بہت فیاضی دکھا رہے تھے۔

چائے کے بعد شرمین برق رفتاری سے برتن سمیٹ کر اندر لے گئی۔ واپس آئی تو علی اٹھ کر چپ چاپ اسی سمت چل دیے جدھر اُس نے اشارہ کیا تھا۔ رانی جانتی تھی وہ اُن کو لان کے بلند و بالا درخت پر بنے اُس گھونسلے کو دکھانے لے گئی ہے جس میں اُس نے طوطوں کے بچے دیکھ رکھے تھے۔ آج کل اُس کی تمام تر توجہ انہی بچوں کی طرف رہتی تھی۔

ان دونوں کے جانے کے بعد رانی دوبارہ اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی اور ماسی وہاں گھاس پر بیٹھی گوار کی پھلیاں بنانے لگیں جو وہ کچن سے اٹھالائی تھیں۔ تھوڑی دیر میں علی اور شرمین واپس آ گئے۔ شرمین بڑی پُر جوش نظر آ رہی تھی اور زور و شور سے اپنی اس "دریافت" کی تفصیل سنا رہی تھی۔ علی بڑی سنجیدگی سے نہ صرف یہ کہ سن رہے تھے بلکہ اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

جب شرمین کی باتیں ختم ہو گئیں اور اُسے پورا اطمینان ہو گیا کہ کسی نے اُس کی باتیں پوری توجہ اور یکسوئی سے سنی ہیں تو وہ مطمئن ہو کر وہاں سے چل دی اور فوارہ کے گرد پودوں کو پانی دینے میں مصروف ہو گئی۔ اب علی نے سکون کا ایک گہرا سانس لیا اور ہاتھ بڑھا کر رانی کے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے بولے۔ "خدا کا شکر ہے شرمین تو مطمئن ہوئی۔"

"خوش تو آپ بھی کم نہیں لگ رہے۔"

رانی نے دھیرے سے کہا مگر انہوں نے سن لیا۔ فلسفیانہ انداز میں بو
"دراصل...... ہماری اپنی خوشی میں بچوں کی خوشی بھی چھپی ہوتی ہے۔ بچوں کو خو
باش رکھنا بہت آسان ہے۔ بس ان کی بات توجہ اور دلچسپی سے سن لی جائے۔ وہ ا
اہمیت کا احساس کر کے از خود مطمئن اور پرسکون ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں بیٹا! بالکل سچ کہتے ہو۔" اس مرتبہ ماسی مریاں نے دخل اندازی کی۔

"بچوں کو مطمئن کرنا بہت بڑا فن ہے جو ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔"

"اچھا آپ یہ کون سی ترکاری بنا رہی ہیں؟" علی نے موضوع بدلنے کی خاطر ا
سے پوچھا۔

"بیٹا یہ گوار کی پھلی ہے۔" ماسی مریاں نے فوراً ہی اُن کی معلومات میں اضا
کیا۔

"گوار کی پھلی۔ میں نے تو کبھی نہیں کھائی یہ سبزی۔ نام بھی نیا لگ رہا ہے۔"

رانی مسکرا دی۔ ماسی سوکھا سا منہ بنا کر بولیں۔ "یہاں بھی کوئی نہیں کھاتا
مجھے بہت بھلی لگتی ہیں۔ ہفتے میں ایک آدھ دفعہ اپنے لیے بنا لیتی ہوں۔ بیگم صا
بھی کبھار چکھ لیتی ہیں میرے ساتھ لیکن یہ دونوں تو خدا کی پناہ! مجال ہے جو ہاتھ
لگا لیں اور وہ شرمین! ماسی مریاں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر بتایا۔ "گوار کی پھلی"
بجائے کہتی ہی "گنوار کی پھلی" ہے اور زور سے اعلان کر دیتی ہے۔ "اسے تو بکر
کھاتی ہیں۔"

علی زور سے ہنسنے لگے۔ رانی منہ پھیر کے مسکرانے لگی۔ شرمین ان تمام با
سے بے نیاز زور و شور سے پودوں کو پانی سے نہلا رہی تھی اور جانے کیا گنگناتی جا
تھی۔

"ہا...... ہا...... بچپن بھی کیا انمول زمانہ ہوتا ہے۔" ماسی مریاں نے بیٹھے

ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ "نہ کسی بات کی فکر نہ کسی سوچ کا گزر۔"

"جی ہاں...... یہ تو حقیقت ہے، کوئی شبہ نہیں اس سچ میں۔" علی نے ان کی ہاں
میں ہاں ملائی۔

"ہاں میاں! ایک زمانہ ہم پر بھی ایسا گزرا ہے، نہیں جانتے تھے کہ دُکھ درد
تکلیف، غم، پریشانی اور مصیبت کس بلا کا نام ہے۔" ماسی مریاں بولنے پر آئیں تو بولتی
چلی گئیں۔ "ہم تھے اور ہنسی کی پھواریں تھیں۔ ہم تھے اور قہقہوں کی برساتیں تھیں۔
جس طرح ساون کے اندھے کو ہر طرف ہریالی ہی ہریالی دکھتی ہے، اسی طرح ہم بھی
زندگی کو ایک دل کش نغمہ اور ایک مسلسل قہقہہ سمجھتے تھے۔ نہیں معلوم تھا اُس وقت کہ
زندگی دراصل مصیبت و آلام اور دکھوں آنسوؤں کا گڑھا ہے بلکہ ایک ایسا آتش کدہ
ہے جس میں غریب کے آنسو مسلسل تمام عمر گرتے رہتے ہیں، برسات کی طرح مگر یہ
آتش کدہ بجھنے میں نہیں آتا۔ دھیرے دھیرے غریب کے تمام ارمان، تمنائیں اور
آرزوئیں سلگ سلگ کر اسی کے اندر جل کر بھسم کر ختم ہو جاتی ہیں اور بچ جائے ارمانوں
کی حسرتیں بن بن جاتی ہیں......"

علی اور رانی حیرت سے ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ معلوم نہیں وہ
اس وقت کس موڈ میں تھیں۔ تاہم رانی کبھی کبھار ان کی ایسی باتیں سن چکی تھی مگر علی کا
پہلا چانس تھا۔ وہ بڑی حیرت اور دلچسپی کے ساتھ ان کی ایسی فصیح و بلیغ گفتگو سن رہے
تھے۔

وہ جیسے ہی چپ ہوئیں، علی نے فوراً ان کی حوصلہ افزائی کی۔ "آپ کی باتیں تو
بہت گہری اور فکر انگیز ہیں...... معلوم ہوتا ہے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے
آپ نے!"

"ارے میاں!" ماسی مریاں بڑے دکھ سے ایک گہرا سانس بھر کر کہنے لگیں۔

"زندگی کو ہم نے کیا قریب سے دیکھا ہے بلکہ زندگی ہم سے ہمارا سب کچھ ایک جھ[illegible] سے چھین لے گئی تھی۔"

"بھلا وہ کیسے؟" علی نے بیچ میں لقمہ دیا۔

رانی نے ان دونوں کے درمیان کوئی دخل نہ دیا بلکہ چپ چاپ بیٹھی کان دیے رہی تھی۔ اب تو اُسے بھی اک تجسس سا محسوس ہونے لگا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ما[illegible] مریاں اپنے بارے میں کوئی اہم انکشاف کرنے والی ہوں مگر وہ صاف کی ہوئی ہری [illegible] چھلیاں اپنے سامنے کھسکا کر اب چاقو سے کاٹنے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ انہیں نہ [illegible] حیرت کی پروا تھی اور نہ رانی کے تجسس کی بلکہ صاف محسوس ہو رہا تھا گویا وہ اپنے آپ [illegible] کھوئی ہوئی ہیں۔ کچھ دیر تک ماحول پر ایک گہرا سکوت اور جامد سناٹا طاری رہا جس [illegible] ان لوگوں کی مدھم مدھم سانسیں ڈوبتی اُبھرتی رہیں۔ پھر رفتہ رفتہ ماسی مریاں کی بڑبڑا[illegible] قدرے بلند اور واضح ہونے لگی۔ وہ کسی کو مخاطب کیے بغیر کہہ رہی تھیں۔

"اللہ...... اللہ...... کیا کیا خوب صورتیاں اور حسن سمایا ہوا تھا ہماری چھوٹی سی [illegible] میں شاید دنیا کی ساری رعنائی اور تمام دل فریبیاں وہیں سمٹ آئی تھیں۔ سر[illegible] شاداب پیڑوں کے جھنڈ میں کوئل کوکتی تھی۔ گھنگھور سیاہ گھٹائیں جھوم جھوم کر [illegible] تھیں۔ کلیاں کھلتی تھیں۔ پھول ہنستے تھے۔ باجرے کے ہرے کھیتوں میں [illegible] بے شمار چڑیاں چہچہاتی تھیں۔ بگلوں کے غول کے غول اُڑتے پھرتے تھے۔ جنگل [illegible] ست رنگے پروں والے حسین و جمیل مور پر پھیلائے ناچا کرتے تھے۔ [illegible] جھاڑیوں میں سرِشام سرسرانے والی البیلی ہوائیں ساری بستی میں گنگناتی پھرتی [illegible] اور لہراتی بل کھاتی ندیا کا پانی چاندنی راتوں میں پگھلی ہوئی چاندی کی مانند تھا [illegible] کرتا تھا...... ہائے...... کیا سہانے زمانے تھے!! جو پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے۔ ناشپاتی، امرود اور آم کے باغات سے لے کر آسمان کے چاند سورج اور جگمگ[illegible]

[illegible]رے لاکھوں ستارے اپنی ذاتی ملکیت لگا کرتے تھے۔ پوری کائنات مختصر اور مکمل ہو کر اپنی آنکھوں کے سامنے مجسم لگا کرتی تھی۔ دراصل اُس وقت ہم دنیا کو ایک بچے کی نگاہ سے دیکھ کر یہی محسوس کرتے تھے کہ پوری دنیا ہماری بستی اور ہمارا گھر ہے۔ باقی کچھ نہیں۔ ہماری کم سنی اور لاعلمی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جوں جوں بڑے ہوتے جائیں گے دنیا کے یہ دل فریب و خوب صورت چہرے کے رنگ بکھرتے جائیں گے اور نقوش بگڑتے جائیں گے۔ کاش! اس وقت اس حقیقت پر یقین ہوتا! یا پھر ہم بڑے ہی نہ ہوئے ہوتے! تو پھر اُن مصیبت و آلام کی صورت نہ دیکھنی پڑتی جس نے بعد کو ہماری زندگی اجیرن کر دی اور ہمیشہ کے لیے سر جھکا کر چلنے پر مجبور کر دیا۔ علی ماسی مریاں کے اتنے خوب صورت طرز بیان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ تھوڑی دیر کو یہ بھی فراموش کر بیٹھے کہ رانی بھی ان کے قریب بیٹھی یہ سب سن رہی ہے۔ انہوں نے آگے کو جھک کر ماسی مریاں کے بوڑھے شانوں کو تھام لیا اور بڑی سچائی سے کہنے لگے۔ "میں خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ آپ اندر سے اتنی دکھی ہوئی ہیں اور ___ اور اتنی خوب صورت اردو کہاں سے سیکھی آپ نے! اور پنجابی زبان پر بھی مکمل عبور ہے آپ کو۔" شرمین اور رانی تعریف کرتی نہیں تھکتیں! ماسی مریاں کے سرخ و سپید چہرے پر خوشی اور مسرت ہنسی بن کر بکھر گئی۔

"بس میاں!" وہ بڑی فراخ دلی سے ہنس پڑیں۔ "یہ سب وقت وقت کی باتیں ہیں۔ زمانے اور حالات کے تھپیڑے انسان کو کچھ نہ کچھ سیکھتے رہنے پر مجبور رکھتے ہیں۔ یہاں بھی تھے کچھ ___ بن گئے کچھ ___ کل تھے کچھ ___ آج ہیں کچھ ___ ایک زمانہ تھا جب اپنی بستی میں بستے تھے تو رہن سہن بول چال پنجابی تھی۔ زمانہ بدلا، حالات نے پلٹا کھایا تو عام اردو بھی نہیں بلکہ نوابی اردو سے واسطہ پڑا اور وقت نے وہی کچھ سیکھنے پر مجبور کر دیا جو حالات نے سکھایا تو میاں! یہ سب وقت وقت کی باتیں ہیں۔

جیسی جیسی ٹوٹ پھوٹ اور جوڑ توڑ رب نے نصیبوں میں لکھ دی ہوتی ہے وہ بہر حال پوری ہو کر رہتی ہے۔"

"ماضی میں آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟" علی نے بات گھما کر پوچھی۔

"تھی ایک پھولوں بھری وادی اور نغموں سے لبریز بستی۔" انہوں نے سادگی سے جواب دیا۔

"ابھی اُسی بستی کا ذکر تو کیا ہے اگر نام بہت ہی ضروری ہے تو اس کا نام 'بہا پور' سمجھ لو۔ اُدھر بہاول پور سائڈ پر تھی ایک چھوٹی سی بستی۔ میری پیدائش بھی وہیں ہے۔ سارا بچپن وہیں گزرا۔ میں نے اس جہانِ رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں اور ماں نے بند کر لیں...... بس اتنی سی بات پر بابا نے کبھی نظر اُٹھا کر یا جی بھر کر مجھے دیکھا۔ پتا نہیں رو دھو کر کس طرح پل بڑھ گئی۔ کیوں کہ کوئی بڑا تو کیا چھوٹا بہن بھائی بھی نہ تھا۔ تن تنہا اکیلی اور اکلوتی اولاد...... سنتی تھی اللہ میاں نے مجھ سے پہلے آٹھ بہن بھائی اور بھی عطا فرمائے تھے مگر مشیتِ ایزدی میں کسے دخل' چند ماہ کے ہو ہو کے سب داغِ مفارقت دے گئے۔ آخر میں، میں ہی ایک زندہ بچی مگر ایسا بچنا کس کام کہ پیدا کرنے والی ماں نہ رہے۔ لیکن میرے ساتھ تو ایسا ہی ہوا۔" وہ ایک لمحہ کو رکیں

اس بستی میں ایک بہت بڑا بلکہ اس علاقے کا سب میں بڑا قبرستان تھا۔ آس پاس کی ساری چھوٹی چھوٹی بستیوں کے لوگ اپنے مردے اس قبرستان میں لے کر آتے تھے میرے بابا اس قبرستان کے گورکن تھے۔ بہت سخت مزاج' اکھڑ اور اپنے آپ میں گم رہنے والے بندے باہر کی دنیا سے انہوں نے اپنا واسطہ بہت کم کم' بلکہ یوں سمجھو کہ نہ ہونے کے برابر جوڑ رکھا تھا۔ سارا سارا دن کدال ہاتھ میں لیے اس قبرستان کے اندر اندر گھومتے پھرتے رہتے۔ ویسے تو اتنی وسیع و عریض جگہ کی دیکھ بھال اور دیگر کام کاج ہی ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے کی کڑیاں تھیں اور اوپر سے بابا کی اپنی اُفتادِ مزاج......

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

دنوں مجھ سے بات نہ کرتے تھے۔ قبروں کی نگرانی' ٹوٹ پھوٹ کی ذمہ داری' گھاس پھوس اور ٹوٹے پتوں کی صفائی یہ سب ایسے کام تھے کہ وہ تمام دن مصروف رہتے پھر آس پاس کی کئی بستیوں سے منسلک رہنے کی وجہ سے ہر روز ایک دو میتیں آ جاتیں بابا اور بھی زیادہ مصروف ہو جاتے۔

قبرستان کے چاروں طرف کچی مٹی کی ایک قدِ آدم چہار دیواری بنی ہوئی تھی تاکہ چھوٹے موٹے جانوروں سے حفاظت رہے اسی احاطے کے اندر ایک خاصا بڑا سا کشادہ مکان گورکن اور اس کے کنبے کے لیے بنا ہوا تھا۔ اسی کچے گھروندے کے در و دیوار تلے' پیدا ہونے سے بچپن تک کے پھر لڑکپن سے آغاز جوانی تک میں نے سینکڑوں گھڑیاں اور زندگی کے لمحے تنہا کھیلتے' ہنستے' روتے گزار دیے۔ بعض راتیں تو ایسی آتیں کہ بابا کو سوتے سے اُٹھا کر بلوا لیا جاتا۔ جیسے ہی رات کے سناٹے میں بہت سارے جوتوں کی چاپیں ابھرتیں اور زور زور سے کنڈی بجتی' بابا کتنی ہی گہری نیند سوئے ہوتے' اپنا صافہ سنبھالتے' آوازوں کا جواب دیتے' اُٹھ کر باہر چلے جاتے اور اکثر ایسا بھی ہوتا کہ صبح کا اُجالا چاروں طرف پھیل جاتا' پیڑوں پر چہچہاتی چڑیاں دانے دُنکے کی تلاش میں اُڑ جاتیں تب وہ واپس آتے۔

شاید دن رات مردوں میں رہتے رہتے بابا خود بھی اُن ہی جیسے بے حس' بے خبر اور بے درد ہو چکے تھے یا پھر اپنی ذاتی زندگی کے المیے نے انہیں اندر سے اس قدر توڑ پھوڑ ڈالا تھا کہ وہ پتھر ہو گئے تھے۔ بچوں کا ہو ہو کر مر جانا اور پھر شریکِ حیات کی دائمی جدائی۔ یہ دردناک اُن کو ایک لاعلاج مرض بن کر چمٹ گئے پھر وہ تمام عمر کھل کر نہ ہنس سکے۔

یہ سب تھا مگر جوں جوں سمجھ آئی۔ میں یہ سوچ سوچ کر کڑھا کرتی اس تمام قصے میں میرا کیا قصور ہے؟ میں نے کیا کیا ہے؟ میرا کوئی گناہ' کوئی خطا' کوئی جرم...؟

میں کس غلطی کی سزا کاٹ رہی ہوں؟ آخر میرے بابا' مجھے کس جرم کی پاداش میں بیٹی نہیں سمجھتے! انہیں احساس کیوں نہیں کہ میں محض ایک بچی ہوں! جو کچھ ہو گزرا اس میں اس پروردگار عالم کی کوئی بڑی مصلحت پوشیدہ ہو گی۔ میں تو بے جرم و خطا سزا کی مستحق نہ تھی۔ مگر یہ سب باتیں بابا سے بھلا کون دریافت کر سکتا تھا! لیکن سچ پوچھو تو مجھے ان سوالوں کے جوابات کی کچھ ایسی جستجو اور پروا بھی نہ تھی۔ کم سنی اتنی سادہ اور سوچیں اس درجہ معصوم تھیں کہ بابا کا ٹھنڈا ٹھنڈا رویہ گراں گزرتا تھا نہ اپنی ذات کی کم مائیگی کا احساس گوارا بن کر لگتا تھا' بلکہ کبھی کبھی ایسا خیال بھی گزرتا تو یہ سوچ کر نظر انداز کر دیتی کہ شاید باپ ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔ اور یوں بھی بابا نے میری ذاتی ضرورتوں کو کبھی نظر انداز نہ کیا تھا۔ عید بقر عید پر اتنے جوڑے کپڑے رنگ برنگے آ جاتے کہ سال بھر پہنتے پہنتے نہ چکتے تھے۔

جب تک بہت ہی چھوٹی تھی' بابا کے پیچھے میں بھی سارا دن قبروں میں ادھر ادھر ماری ماری پھرا کرتی۔ پھر جوں جوں شعور آتا گیا' گھر کے کام کاج کی طرف متوجہ ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ میری دلچسپی میں اضافہ ہوتا گیا اور میں گھر کی جھاڑ پونچھ پکانے اور دیگر گھریلو کام توجہ اور لگن سے کرنے لگی اور بہت جلد ان سارے کاموں میں ماہر بھی ہو گئی۔ گھر بہت کشادہ اور کچا تھا۔ باہر بھی چکنی کچی مٹی کی کمی نہ تھی۔ اکثر فارغ وقت میں گھر کے در و دیوار لیپنے پوتنے کے بعد بچی مٹی کے گارے سے چڑیاں طوطے اور کبھی تو ننھے ہانڈیاں' گلاس' جگ اور پلیٹ پیالیاں وغیرہ بنانے میں لگی رہا کرتی۔ اس مصروفیت سے اکتا جاتی تو گھر سے باہر نکل جاتی۔

کبھی کبھار قبرستان کے احاطے سے باہر کی دنیا دیکھنے کو مچل دیتی۔ خوب صورت بستی کے جاں فزا نظارے دیکھتے دیکھتے جی نہ بھرتا۔ ادھر سے ادھر گھومتے پھرتے گھر لوٹتی تو اس روز بابا ضرور ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیتے۔ تب مجھے اچانک ہی احساس ہوتا

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

کہ میں اس دنیا میں اکیلی نہیں ہوں بلکہ مجھ سے بے خبر اور لاعلم رہنے والے بابا' میرے ہر اقدام سے آگاہ اور باخبر رہتے ہیں۔ پھر اس ڈانٹ کے نتیجے میں بہت دن تک میں بستی کا رخ کرنے کی ہمت بھی نہ کر پاتی۔ قبرستان کے احاطے سے باہر نکلتی ضرور مگر کچھ فاصلے پر ریت کے ٹیلوں پر اگے ہوئے بے شمار پیلو کے جھاڑوں سے پکے پکے ہوئے پیلو توڑ توڑ کر اپنی اوڑھنی میں جمع کرتی رہتی اور جب اس شغل سے بیزار ہو جاتی تو تھک ہار کر واپس اپنے گھر لوٹ آتی۔

رانی جو بہت توجہ سے ماسی مریاں کی دلچسپ آپ بیتی سننے میں منہمک تھی چونک کر پوچھ بیٹھی۔ "آپ کو قبرستان میں ڈر نہیں لگتا تھا۔ قبروں اور مردوں سے ڈر کاہے کا۔" ماسی مریاں بے پروائی سے ہنس دیں۔ مجھ سے تو اگر کوئی پوچھے تو اپنی ساری زندگی کا سب سے زیادہ یادگار اور خوب صورت ترین زمانہ وہی لگتا ہے۔ بار بار ہاتھ ملتی ہوں کہ کاش! وہی شب و روز واپس لوٹ آئیں۔ میں دوبارہ چھوٹی ہو جاؤں اور اسی قبرستان میں قبروں کے آس پاس ماری ماری پھرا کروں مگر ایسا بھلا کسی کے ساتھ ہوا ہے جو میرے ساتھ ہو گا! بلکہ اب تو وہ وقت آ چکا ہے کہ عمر کے اس آخری حصے کا کہ یہ ارمان دل میں لیے لیے قبر میں جا سوئیں گے۔"

"ارے تو یہ تو بہ" علی جلدی جلدی دونوں کانوں کو چھو کر بولے۔ "آپ ایسی مایوسی کی باتوں پر خاک ڈالیے۔ بس اپنی داستان حیات مکمل کیجئے۔ مجھے بہت اشتیاق پیدا ہو گیا ہے اور ادھر دیر بھی بہت ہو رہی ہے۔"

"سچ تو یہ ہے بیٹا!" ماسی مریاں نے رانی کی طرف دیکھتے ہوئے گویا اس کا سوال یاد رکھا۔ "ڈر یا خوف کس بلا کو کہتے ہیں؟ مجھے معلوم نہ تھا۔ بس اپنے آپ میں مگن اور مست و بے خود رہتی تھی۔ پھر مردوں اور قبروں کا ڈر کیا! دراصل آنکھ کھول کر یہی ماحول اور وہی فضائیں دیکھی تھیں۔ اسی قبرستان میں میرے آٹھ نو برس بیتے ہوں

کی مٹی مٹی قبریں تھیں۔ ایک طرف اماں پڑی ابدی نیند سو رہی تھیں۔ بابا ہر دم جھاڑ جھنکار اکھاڑتے، مٹی برابر کرتے اِدھر اُدھر گھوما کرتے۔ بھلا تم جانو ایسے میں کون ڈر سکتا تھا۔ آخر کو میرا وہاں پورا کنبہ موجود تھا! میری تو سہیلیاں وہی قبریں تھیں۔ سردی گرمی بہار و خزاں سارے موسم ان کے درمیان کٹتے۔

احاطے کے اندر بہت پرانے پرانے درخت بھی تھے۔ ان میں بہت سے پھل دار بھی۔ ہر موسم میں میرے مزے آ جاتے۔ کھاتے کھاتے جی اُوب جاتا مگر اونچا گھنا، چھتنار املی کا پیڑ مجھے سب میں زیادہ توجہ کا مستحق نظر آتا۔ میں سارے دن گھوم پھر کر بار بار اسی کے نیچے جا پہنچتی۔ املی کے کھٹے کھٹے کتارے میری کمزوری تھے اور میں بلا شرکت غیرے اس کی مالک و مختار تھی۔ اسی طرح کی بیتا بے شمار یادیں ہیں۔ کیا کیا سناؤں تمہیں! کہاں تک سنو گے تم لوگ بلکہ شاید پریشان ہی ہو جاؤ گے بوڑھی عورت کی بے تکی راگنی سن کر۔" ماسی مریاں نے اک اداس مسکراہٹ سے اپنی بات مکمل کی۔



چھٹپن میں جو بھاگ بھاگ بستی جایا کرتی اور واپس آ کر بابا کی ڈانٹ پھٹکار سنا کرتی تھی تو جوں جوں بڑی ہوتی گئی' بستی کے خیال سے دست بردار ہوتی گئی اور پھر ایک وقت یہ بھی آیا کہ خود بہ خود میں ایک دائرے کے اندر محدود ہوتی گئی۔ میں نے پورے طور پر یہ سمجھ لیا کہ گھر اور گھر کے آس پاس ہی رہنا میرے لیے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ بابا بھی شاید مطمئن ہو گئے تھے' پھر اُنہوں نے مجھے کبھی گھر کے' ڈانٹنے کی زحمت گوارا کرنا بھی ترک کر دی۔ ماسی مریاں نے اپنی داستانِ حیات بیان کرتے ہوئے کہا۔ "اُس زمانے میں گھر سے باہر میری دلچسپی کا مرکز املی کے پیڑ کے علاوہ قبرستان کے احاطے سے باہر ریت کے وہ ٹیلے تھے' جن پر چھوٹے قد والی بیریاں اور پیلو کے بے شمار جھاڑ ہوا کرتے تھے۔ بیروں کے موسم میں سرخ سرخ کھٹ میٹھے بیر کھا کھا کر زبان سُن ہو جاتی مگر نیت سیر نہ ہوا کرتی۔

اب میں پورے قد کاٹھ کی مکمل مریاں بن چکی تھی اور خوب بڑی بڑی لگنے لگی تھی مگر بابا نے مجھے ٹیلوں پر جانے کی ممانعت نہیں کی تھی' شاید اس لیے کہ بستی سے اتنی دور وہاں کوئی دوسرا ہوتا بھی نہ تھا۔ کبھی کبھار بستی سے بھولے بھٹکے مویشی گھاس اور ہریالی کی تلاش میں دوڑتے بھاگتے اِدھر آ نکلتے تو اُن کے تعاقب میں چرواہا بھی ہانپتا' نعرے برساتا چلا آ رہا ہوتا۔ ورنہ تو جنازوں کے ساتھ آنے جانے والوں کے علاوہ

کم ہی کسی کا گزر ان اطراف میں ہوا کرتا تھا۔

ایک بھری دوپہر یا میں حسبِ معمول ٹیلوں پر پیلو چُن رہی تھی۔ خوب صورت رنگت والے پکے پیلوؤں سے میرا رومال بھرا آن بھرتا جا رہا تھا۔ اب بہت دن سے میں نے اوڑھنی میں پیلو اور بیر جمع کرنا چھوڑ دیے تھے بلکہ اس مقصد کے لیے لال رنگ کا ریشمی رومال بنایا تھا۔ اس رومال کو میں جھاڑیوں کے درمیان کسی صاف زمین پر بچھا دیتی اور اپنا گوہرِ مقصود توڑ توڑ کر اس پر ڈھیر کیے جاتی۔

اُس روز بڑی تیز دھوپ تھی۔ سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی رہا تھا جیسے ماحول میں چنگاریاں سی سلگ رہی ہوں۔ ٹیلوں پر اور بھی زیادہ تپش اور گرم سماں تھا۔ تم لوگوں کے وقت کی کوئی لڑکی ہوتی تو کبھی بھی اس گھٹن اور حبس میں پیلو چننے جاتی مگر جیسی ہمارے وقتوں کی تو بات ہی دوسری تھی۔ نہ سردی گرمی کا احساس ہوتا تھا نہ مشقت سے گھبراہٹ بلکہ ہر وقت اک سرخوشی اور طمانیت کی کیفیت رہتی تھی۔

جانے کتنا وقت گزر رہا ہوگا کہ مجھے احساس ہوا۔ یوں جیسے کوئی معمول سے ہٹ بات ہوئی ہو۔ میں چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی مگر دور تک جھڑبیریوں اور سنسان پیلو کے جھاڑوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں دوبارہ پیلوؤں کی طرف متوجہ ہو لیکن دوسری آواز پہلی آواز سے زیادہ تیز اور واضح تھی۔ میں فوراً ہی جھاڑیوں سے باہر نکل آئی اور متجسس نظروں سے ہر طرف دیکھنے لگی اور جلد ہی اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو گئی۔

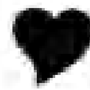
ٹیلے کے نشیب میں بستی کی طرف سے آنے والے کچے راستے پر چلتی آ بھاری بھرکم جیپ آ کر رکی تھی اور اُس کا دروازہ کھلنے کی آواز ہی سنانے میں دور تک گونج گئی تھی۔ میں گردن بڑھا کر نیچے دیکھنے لگی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے جیپ سے تین آدمی اُترے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اور بغیر کوئی آواز نکالے ہو

قبرستان کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے۔

یہ کچھ ایسی انہونی نہ تھی۔ میں دوبارہ پیلو توڑنے میں مصروف ہو گئی مگر فوراً ہی اُٹھ گئی۔ دھیان بار بار چمکتی لشکارے مارتی جیپ کی طرف جا رہا تھا شاید میں نے اپنی زندگی میں اوّل بار اتنی شان دار چیز دیکھی تھی۔

دل اندر سے بے ایمان ہونے لگا۔ سوچا کیوں نہ اتنی پیاری چیز قریب سے دیکھ آؤں۔ جانے پھر موقع ملے کہ نہ ملے! میں نے تیزی سے پیلو سمیت رومال سمیٹا اور جلدی جلدی ٹیلے سے اُتری دھپ دھپ گاڑی کے پاس جا ٹھہری جو پاس سے اور بھی زیادہ طرحدار اور بارعب لگ رہی تھی۔ میں چاروں طرف سے گھوم گھوم کر اس کا جائزہ لینے لگی۔ کالے سیاہ بڑے بڑے پہیوں پر کھڑی یہ جیپ میرے نزدیک دنیا کا عظیم ترین عجوبہ تھی۔ اس کے چمکتے ہوئے شفاف شیشوں کے پیچھے آرام دہ سیٹیں اور اسٹیرنگ صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولنے کی کئی بار کوشش کی مگر ناکام رہی۔ تھک ہار کر میں پھر اُسے جھانکنے اور تاکنے میں مصروف ہو گئی۔ تھوڑی دیر گزری تو مجھے پھر ہوک اُٹھی۔ بار بار جی مچل رہا تھا کہ آرام دہ نشستوں پر بیٹھ کر دیکھا جائے۔ اس ارمان کو پورا کرنے کے خیال سے میں نے پھر سے اُس کے دروازے پر زور آزمائی شروع کر دی۔ عین اُس وقت کوئی زور سے دھاڑا۔

"اوئے! یہ کیا کرتا ہے؟"



"اوئے! ایہ کیا کرتا ہے؟"

میں اُچھل پڑی۔ ساتھ ہی بدک کر بھاگنا چاہا لیکن دو مضبوط ہاتھوں نے م
طرح دبوچ لیا۔ میرے منہ سے مدھم سی چیخ نکل گئی۔

"ارے چھوڑو...... چھوڑو...... چھوڑ دو اسے فوراً!" کسی نرم آواز نے مداخلت
کی۔

گرفت فوراً ڈھیلی ہو گئی۔ آزاد ہوتے ہی میں اُس سخت سخت ہاتھوں والے
علیحدہ ہو کر ذور جا کھڑی ہوئی اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ میں ابھی تک بید مجنوں
مانند کانپ رہی تھی۔ لرزاں اور بدحواس کھڑی تھی۔ اس جدوجہد اور بھاگ دوڑ
میرا پلو بھر اژدوال چھوٹ گیا تھا اور اب اُڑ کر کسی کے قدموں سے لپٹا پھڑ پھڑا ر
اور پلو یہاں سے وہاں تک موتیوں کی طرح بکھر گئے تھے۔

"کون ہو تم؟" کسی نے ملائم لہجے میں بڑی شائستگی سے دریافت کیا۔ میں
ڈرتے ڈرتے گردن سیدھی کی۔ نگاہیں اُٹھائیں۔ مانو آنکھوں میں پورے چاند
چاندنی اُتر آئی ہو۔

میں نے اپنی پوری عمر میں اتنی اُجلی وجیہہ اور جامہ زیب شخصیت دیکھی نہ سنی تھی
پ تک اپنے میلے کچیلے بابا کے علاوہ بہت کم لوگوں کو دیکھا تھا مگر اُس جیسا کوئی نہ
چند ثانیے مسحور ہو کر دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

اُن کے چہرے سے لے کر آنکھوں تک بڑی ہی دلآویز مسکراہٹ بکھری ہوئی
ا۔ یوں جیسے ابھی ہنسے کہ تبھی ہنسے۔

اور مجھے ہونقوں کی طرح دیکھتے پا کر سچ مچ ہنس پڑے۔ مجھے یوں لگا جیسے پوری
ہنسنے لگی ہو۔ میری محویت ٹوٹ گئی۔ اُنہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی سنہری چھڑی
ں دفعہ ہلکے ہلکے سے میرے سر پر ماری اور دوبارہ گویا ہوئے۔ "ہم پوچھ رہے ہیں
پ کون ذات شریف ہیں؟"

میرے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ بہ مشکل نکلے۔ "...... میں...... مر......
مریاں ہوں۔"

"مریاں!" اُنہوں نے زیرِ لب دہرایا۔ "عجب بے تکا...... ہمارا مطلب ہے
ل وجب نام ہے۔" اُنہوں نے ان دونوں آدمیوں کی طرف دیکھ کر کہا جو شاید اُن
نوکر تھے۔

"ہمارے خیال میں تمہارا نام مہک، چاندنی، نیلم، شبنم، خوشبو یا ملائکہ وغیرہ ہونا
ہے تھا۔" اُنہوں نے کسی ایسے انجانے انداز میں کہا کہ کچھ نہ سمجھ سکنے کے باوجود
ے جی کو بھلے لگے۔

"رہتی کہاں ہو؟" اُنہوں نے پھر سوال کر دیا۔

"وہ...... اِدھر......" میں نے ہاتھ اُٹھا کر قبرستان کی طرف اشارہ کیا۔ اُنہوں
میرے اشارے کے تعاقب میں قبرستان کی طرف دیکھا۔ صورت پر حیرت کے
رنمایاں ہو گئے۔ کچھ نہ سمجھ سکنے کے انداز میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگے۔

اُن کی حیرت اپنے مقام پر بجا تھی کیوں کہ یہاں دُور تک انسانی آبادی کے آثار تھے۔ ہاں! ویران قبروں کے درمیان باؤلی ہوائیں سر پٹختی پھر رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتی' اُن دونوں میں سے ایک آدمی نے اُن کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''جناب والا! یہ اِس قبرستان کے گورکن کی بیٹی ہے۔ یہیں چار دیواری میں اُس کی کُٹیا ہے۔''

''اوہو...... اب سمجھ میں آیا۔'' انہوں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا جیسے ہنسی روک کر کہنے لگے۔ ''اچھا ہوا تم جانتے ہو۔ ورنہ ہمیں تو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں...... کسی رُوح سے واسطہ نہ پڑ گیا ہو۔'' اُن کے ساتھی ہنس پڑے۔

میں بولائی ہوئی بے وقوفوں کی طرح سب کی صورت دیکھتی رہ گئی۔

''یہ...... تمہارے پھل تو سارے گر گئے۔'' انہوں نے ازراہِ ہمدردی کہا جھک کر رومال اُٹھایا اور جھاڑ کر میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے جلدی سے رُومال پکڑ لیا اور مرعوب ہو کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

''اگر کہیں ملتے ہوں تو تمہیں خرید دیں یہ پھل؟'' انہوں نے ایک بار پھر اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کہا۔

''نہیں...... نہیں......'' میں گھبرا گئی ''وہ...... وہاں بہت ہیں یہ پیلو...... اور توڑ لوں گی......''

''اچھا...... ٹھیک ہے۔'' انہوں نے الوداعی انداز میں کہا اور آگے بڑھ کر جیپ میں بیٹھ گئے جو آناً فاناً مجھ سے دُور ہوتی چلی گئی۔ بالآخر ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں کافی دیر باؤلوں کی طرح کھڑی اُدھر ہی دیکھتی رہی۔ کچھ دیر پہلے تک

اپنا کی شان دار ترین ''چیز'' سمجھ رہی تھی تو اب کسی کا سفید کلیوں کے ہمیں کرتے اور پاجامے میں ملبوس سراپا نگاہوں کے سامنے تصویر بنا جا رہا تھا۔ جانے کیوں میں اداس و پریشان سی تھی۔

''دن پر دن گزرے مگر میں اُس من موہنی صورت اور پیکرِ جاہ و جلال کو نہ بھول سکی وہ ہستی جو بہ یک وقت بارعب اور پُروقار بھی تھی اور نرم و ملائم' منکسر المزاج بھی۔

دنوں میں جی ہی جی میں سوچتی رہی۔ وہ یقیناً کسی بہت بڑے ملک کا شہزادہ ہوگا شاید راستہ بھول کر اس قبرستان کی طرف آ نکلا ہوگا! پھر خود بہ خود الجھن سی آ پڑتی۔ وہ کیسے بھٹک گیا ہوگا' اُس کے نوکر بھی تو ساتھ تھے! غرض یہ کہ میری اُلجھن! اُلجھن رہتی۔

بات مختصر...... وقت گزرتا گیا۔



بابا کے شب و روز اُسی طرح بیت رہے تھے۔ آج کل اُن کے ساتھ نوجوان گورکن بھی نظر آ رہا تھا۔ گاہے گاہے اُس شخص کو میں نے قبرستان کے آس پاس منڈلاتے دیکھا تھا پھر وہ بابا کے ساتھ کثرت سے نظر آنے لگا۔ اُن کے پیچھے دوڑ دوڑ کر کرتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے ہاتھ میں کبھی بابا کی کدال اور کبھی دکھائی دینے لگا اور خود بابا کبھی قبرستان کے مشرقی حصے میں کبھی کسی پیڑ کے نیچے ٹوٹی پھوٹی دیوار کے سائے میں اپنا پیالہ اور پوری حقہ لیے گڑگڑاتے دکھائی دیتے۔ نوجوان تو کیا' اچھی خاصی عمر کا بندہ تھا۔ تھوڑے دنوں میں اُس کا نام "ماکھے" سننے میں آیا۔ بابا کو اُس کے آنے سے بہت آرام مل گیا تھا۔ شاید اب اُن کی عمر کا یہ تقاضا تھا اس لیے انہوں نے "ماکھے" کے سامنے بڑی جلدی سپر ڈال دی اور طرح سے اُس کے جیسے محتاج ہوتے چلے گئے۔ وہ اُس کی مستعدی' تیز رفتاری اور حضوری" سے بہت خوش تھے اور اکثر اُس کی تعریف کرتے رہتے لیکن مطلق کیوں بابا جتنے اُس سے مطمئن تھے مجھے اتنا ہی وہ برا لگتا تھا۔ وہ اکثر گھیر دار شلوار میلی سی کپڑے کی بنڈی میں ملبوس رہتا تھا۔ بغیر آستینوں کی بنڈی اور اس میں جھلکتے اُس کے کالے کالے موٹے موٹے بازو زہر لگتے اور جب کبھی وہ مجھے

آنکھوں سے میری طرف دیکھتا یا مسکرا دیتا' تب تو جانو میرا اندرون خون جل کر خاک ہو جاتا۔ جی چاہتا کچی اینٹ اُٹھا کر اُس کے منہ پر دے ماروں۔ وہ تو شکر ہے کہ جوں ہی رات ہوتی' وہ کہیں دفعان ہو جاتا۔ شاید رہتا کہیں دوسری جگہ تھا۔ اگلی صبح پھر آ موجود ہوتا۔

رفتہ رفتہ محض اُسی کی وجہ سے میں نے قبرستان کے اندر گھومنا پھرنا ترک کر دیا۔ کیوں کہ وہ شاید اپنا فارغ وقت املی کے پیڑ تلے گزارتا تھا۔ لہٰذا کھانا پکانے سے فراغت پا کر میں گھر کے اندر ہی گیلی مٹی سے چڑیاں طوطے بنایا کرتی اور جب زیادہ اُکتا جاتی تو سیدھی ٹیلوں پر جا پہنچتی۔

اُس دن کے بعد وہ خوش رو اور خوش خواجنبی پھر نہ دکھائی پڑا۔

رُت بدل گئی تھی۔ برسات کی آمد آمد تھی۔ کوئی کوئی رات خوب گھٹن والی اور حبس آلود ہوتی' رات کی کسی گھڑی بادلوں کے پرے کے پرے اُمنڈ اُمنڈ کر آتے آسمان پر روئی کے گالوں سے اونٹ' گھوڑے' پرندے اور رنگ رنگ کے جانور بن بن کر مٹتے رہتے' صبح ہوتے ہوتے سون سون ہواؤں کے جھونکے ان بادلوں کو کہیں سے کہیں لے اُڑتے' دن کے وقت تیز دھوپ اور سورج کی چبھنے والی کرنیں' بدن میں سوئیوں کی طرح گڑنے لگتیں۔

گرمی کے ایسے ہی کچے پکے دنوں میں ایک رات کھل کر بارش ہو گئی۔ سویرے ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ صبح دم باغوں میں کوکنے والی کوئل پہلی بارش کی پیامبر بنی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اُس روز میں بہت دیر تک بان کی چارپائی پر لیٹی کروٹوں پر کروٹیں بدلتی رہی۔

آج کسی پہلو قرار نہ تھا۔ یوں لگ رہا تھا' کوئی انہونی ہونے والی ہے۔

کیا؟...... یہ خبر نہ تھی! بارش تو کب کی تھم چکی تھی مگر منہ اندھیرے کے نکلے بابا

اب تک واپس نہیں لوٹے تھے۔ میں اُٹھ بیٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ماں رسولاں ہاتھ میں میلی سی ٹوکری سنبھالے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ کیچڑ آلود جوتے اُس نے صحن میں اُتارے آگے بڑھ کر ٹوکری مجھے تھما دی۔ مٹی کی روغنی ہانڈی میں تازہ تازہ جنڈ کی پھلیوں کا اچار بھرا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا۔ بابا کا مرغوب ترین اچار تھا۔ جنڈ کی پھلیوں کے اچار کے ساتھ وہ باجرے کی تین تین چار چار روٹیاں کھا لیا کرتے تھے۔ ہمیں یاد ہر دفعہ یہی ماں رسولاں بنا کر دے جایا کرتی۔ ماں رسولاں بستی میں رہنے والی ایک بیوہ عورت تھی جس کے جواں سال بیٹے اور شوہر کی قبریں قبرستان کے جس گوشے میں تھیں بابا اُدھر کی خبر گیری دل و جان سے کیا کرتے اور بدلے میں جنڈ کی پھلیوں کا اچار پایا کرتے۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد چلی گئی تو میں نے چولہے کا رُخ کیا۔ مجھے معلوم تھا آج بابا بہت خوش ہو کر کھانا کھائیں گے۔ میں نے جلدی جلدی باجرے کا آٹا بھگویا اور چولہا سلگانے لگی۔ برسات کی جھڑی لگتے ہی میں بہت سارا ایندھن، پھلی کوٹھڑی میں ڈال دیا تھا لیکن پھر بھی لکڑیاں گیلی گیلی ہو رہی تھیں، نم دار ہواؤں کے جھونکے دھواں اُڑائے لیے جا رہے تھے جیسے تیسے میں آگ جلا ہی لی اور باجرے کی گرم گرم روٹیاں اُتارنے لگی۔ آخری روٹی اُتار کر تو ہی تھا کہ بابا کھنکارتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ باجرے کی روٹیوں پر نگاہ پڑتے ہی اُن کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا۔ وہ سمجھ گئے ماں رسولاں آج جنڈ کی پھلیوں کا اچار دے گئی ہوگی۔ فوراً ہی کسی خیال سے وہ واپس پلٹے اور دروازے سے گردن نکال کر ہانک لگائی۔

"اوئے ماکھے.... آ جا دوڑ کے آ جا تو بھی میرے ساتھ کھا لے۔ آ ڈوڈھے (باجرے کی روٹی) اور پھلیوں کا اچار ہے۔"

For more urdu novels please visit: www.pakistanipoint.com

ماکھے کا نام سن کر میں جل بھن گئی۔

اُس کے آنے سے پہلے پہلے تیار روٹیاں، اچار اور لسی سے بھرا ہوا جگ گلاس اور بھنڈیوں کا کٹورا، جو میں نے گزری شام پکائی تھیں، اندر چٹائی پر رکھ آئی اور ماکھے کو کوستی ہوئی توا دوبارہ چولہے پر رکھ دیا۔ اندر سے باتوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

کھانے کے بعد بابا نے اُس سے کہا۔ "جا ماکھے! گھر چلا جا۔ تو بتا رہا تھا تیری ماں بیمار ہے۔"

"ہاں جی۔ اُسے پچھلے ہفتے (بخ) سے بخار آ رہا ہے۔"

"اُسے دوا دارو لا کر دی یا یوں ہی پڑی ہے؟" بابا نے پوچھا۔

"ہاں جی، کل حکیم جی کو دکھا دیا تھا۔"

"اچھا اب تو فٹافٹ گھر کی راہ ناپ، ایسا نہ ہو بارش تجھے راستے میں آ لے۔ پچھم کی طرف سے بڑے زور کا بادل اُٹھا ہے۔ کچے گھیارے یوں ہی گھٹنے گھٹنے پانی میں ڈوب گئے ہیں۔"

بابا نے بڑی فراخ دلی اور ہمدردی سے اُسے جانے کی صلاح دی۔ اس سے پہلے کہ ماکھا اندر سے برآمد ہوتا، میں چھپاک سے بغلی کوٹھڑی میں جا گھسی۔ تب وہ سارے گھر کو آنکھوں آنکھوں میں ناپ جھانکتا باہر چلا گیا۔

اُس کے جاتے ہی بابا تو پڑ کر سو گئے اور میں برتن بھانڈے سمیٹ کر دھونے مانجھنے بیٹھ گئی۔ صبح سے جو طبیعت میں کسل مندی اور عجیب عجیب خیالات آ رہے تھے، کام دھندے کی دھن میں خود بہ خود ماند پڑ گئے تھے۔

بابا نے ماکھے سے سچ ہی کہا تھا۔ آن کی آن میں آسمان یہاں سے وہاں تک سیاہ گھنگھور گھٹاؤں سے اَٹ گیا تھا۔ ہوا میں سنسناہٹ آ گئی تھی۔ بادل تیار تھے، کوئی دم

جاتا تھا کہ برس پڑتے اور بجلی ہوا جیسے ہی میں کام سمیٹ کر آ رہی تھی' موٹی موٹی بوند(یں)
ٹپاٹپ گرنے لگیں میں نے چوبیس پہر لوہے کی تغاری ڈھکی' بجھی ہوئی لکڑیاں اٹھا
اوپر رکھ کر اندر بھاگ آئی۔ بابا ابھی تک سوئے پڑے تھے۔

کچی چھت پر بوندیں ایک کے بعد ایک تواتر سے گر رہی تھیں۔ باہر قبرستان (کے)
درختوں اور جھاڑیوں میں بارش اور ہوا کے جھونکوں سے جو بھونچال سا مچا ہوا تھا۔ آج
بارش میں ہواؤں کی تیزی غیر معمولی لگ رہی تھی۔ میں نے دل میں سوچا ممکن ہے
بادل اڑا لے جائے اور مینہ تھم جائے۔"

نہ معلوم کتنا وقت گزرا ہو گا کہ بارش کا زور ٹوٹنے لگا۔ بالآخر بوندوں کی تیز ر(فتار)
بوچھاڑ ہلکی پھلکی پھوار میں تبدیل ہو گئی اور ہوائیں میں دھیمی چال چلنے لگیں۔

عین اس وقت کسی نے باہر کے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا۔ [illegible]
جانے کے بعد میں اندر سے کنڈا لگا آئی تھی۔ بابا پہلی دستک پر اٹھ بیٹھے تھے۔ جب
تک دوسری آواز آئی' وہ دروازے تک جا پہنچے تھے۔

کیچڑ سے بچتی بچاتی میں اُن کے پیچھے آئی۔ باہر ایک سے زیادہ افراد تھے اور
انہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

تب کسی نے سرگوشی کے لہجے میں دخل دیا۔ "یار! سمجھنے کی کوشش کر بہت پیار(ی)
تھی بے چاری۔ فوت تو سویرے ہو گئی تھی مگر پانی کی وجہ سے تجھے خبر نہ کر سکے
اب میت کا پیٹ پھولتا جا رہا ہے۔ یار اب خدا کا خوف کر۔ فٹافٹ لحد کھود۔ گرمی کا
ہے کچھ اور نہ ہو جائے۔ ہم میت لے کر آتے ہیں۔"

اصل واقعہ سنتے ہی بابا نے مزید حجت نہ کی اور کدال اٹھا کر فوراً قبرستان کے
اندرونی حصے کا رُخ کیا۔ میں وہیں دروازے پر کھڑی ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگی
موسم کی پہلی بارش خوب کھل کے برس گئی تھی۔ کثرت اُن کچی پکی قبروں کی تھی جو پا(نی)

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

میں ڈوبی ڈوبی لگ رہی تھیں۔ بادلوں بھری اس دوپہر جو گہری اسنڈلی شام کا منظر
پیش کر رہی تھی پورا شہر خموشاں کسی بے نام سناٹے میں گھرا لگ رہا تھا۔ اونچے تناور
درختوں اور ننھی منی وسیع جھم والی جھاڑیوں کا پتا پتا' بوٹا بوٹا' دھلا دھلایا' تر و تازہ ہو گیا
تھا' کہیں کہیں سدا بہار جنگلی پھولوں پر تتلیاں منڈلا رہی تھیں۔ خود رو گھنی جھاڑیوں
کے گہرے سایوں میں برساتی مینڈکوں اور چھوٹی چھوٹی گلہریوں کی اُچھل کود شروع
ہو چکی تھی۔ مینڈکوں کے ٹرانے کی آواز رہ رہ کر ابھرتی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں بھی
املی کے پیڑ کی طرف دوڑ لگا دیتی یا پھر ٹیلوں کا چکر لگانے چل دیتی جہاں جنگلی بیریوں پر
لال لال کھٹ مٹھے بیر بیروں کے حساب سے لدے پھندے میرا انتظار کر رہے ہوں
گے۔ مگر اندر سے دل ہی میں اُمنگ نہ اُٹھی۔ طبیعت بجھی بجھی ہو رہی تھی۔ اندر آنے
سے قبل میری نگاہوں نے بابا کو ڈھونڈنا چاہا۔ کافی فاصلے سے کدال چلنے کی آواز سنائی
دے رہی تھی۔ ہوا سے بابا کے کپڑے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ میں جانتی تھی اب وہ دو تین
گھنٹوں کے لیے مصروف ہو گئے۔ برساتی دنوں میں ہر سال ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ بعض
بعض دن تو بابا صبح سے شام تک برسات کے پانی سے بیٹھ جانے والی قبریں ٹھیک
ٹھاک کرتے رہتے جس کے بدلے میں اکثر لوگ انہیں کوئی معاوضہ دے دیا کرتے
تھے۔ اب جب سے ماکھا اُن کے مددگار کے طور پر نمودار ہوا تھا' صبح کے وقت آنے
والی میتوں کا کام بابا کی نگرانی میں وہ کر لیا کرتا تھا۔ بابا ضرور اُسے کچھ نہ کچھ دیتے
رہتے ہوں گے مگر میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔

میں واپس اندر آ کر چارپائی پر لیٹی تو کافی دیر سوچتی رہ گئی کہ روٹی کھاؤں۔
حالاں کہ باجرے کی ایک روٹی رکھی تھی مگر جانے کیوں چاہتے ہوئے بھی کھا سکی اور نہ
کھانے کو جی چاہا۔ کمرے کی فضاؤں میں پکے ہوئے آموں کی میٹھی میٹھی مہک پھیلی
ہوئی تھی۔ ایک گوشے میں کافی سارے آموں کا ڈھیر لگا تھا۔ کچھ سوچ کر میں جھولی

میں چند چوسنے والے آم اٹھا لائی اور قبر کی مٹی کے ڈھیر پر آ بیٹھی۔ تبھی قبرستان کے پھاٹک کی طرف سے بہت سارے پیروں کی مخصوص چاپیں اُبھرنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی کلمۂ شہادت کی پکار سنائی دی۔

مجھے پتا چل گیا کہ لوگ نئی میت کو کاندھے دیتے ہوئے احاطے کے اندر آ رہے تھے۔ تاہم میرے لیے یہ تقریباً ہر روز کا معمول تھا۔ آنکھ اسی ماحول اور اسی دنیا کے شب و روز میں کھولی تھی اس لیے چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھی آم چوستی رہی۔

اچانک ہوا کے دوش پر ایک دل خراش چیخ میری سماعت سے ٹکرائی۔ ایسی چیخ باقی تمام آوازوں پر حاوی تھی۔

رس بھرا آم میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ میں اٹھ کر اندھا دھند باہر کی جانب بھاگی۔ یہ آواز میں سینکڑوں آوازوں میں علیحدہ سے شناخت کر لینے کی صلاحیت رکھتی تھی اور خوب پہچانتی تھی کہ چیخ کی یہ آواز میرے بابا کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی!

میں سرپٹ کیچڑ، پتھر، پانی اور قبریں الانگتی پھلانگتی اُسی طرف بھاگتی چلی جا رہی تھی جدھر بابا کو کدال چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔

مگر اب وہاں مجھ سے پہلے دسیوں آدمی پہنچ چکے تھے۔ اُن سب نے میرے کو ہاتھوں ہاتھ سنبھال رکھا تھا۔ لیکن وہ آناً فاناً سنبھلے رہنے کی حد پار کر چکے تھے۔ اُن سے چند قدم دور تقریباً ڈیڑھ ہاتھ لمبا کالا سیاہ سانپ پڑا تھا جس کا لوگوں نے لاٹھیاں اور پتھر مار مار کر بھرکس نکال ڈالا تھا۔ بابا کا وہ ہاتھ جس پر اُس نے ڈسا تھا کندھے تک سوج کر نیلا ہو چکا تھا۔ اُن کی رنگت گہری نیلی نیلی نظر آ رہی تھی۔

پل کے پل میں یتیم ہو گئی۔

میرا گھر بھری برسات میں جل گیا اور میں زندہ در گور ہو گئی۔ کوئل کی کوکو نوحہ

کی رم جھم، آموں کے جھنڈ، نالی کے کنارے پیلو کی جھاڑیاں، جھڑبیریوں کے کھٹ مٹھے بیر لمحوں میں بے معنی ہو کر رہ گئے۔

میرے بابا، باجرے کی روٹی اور جنڈ کی پھلیوں کا اچار کھا کر ..... آخری بار کھا کر...... اگلے جہان جا بسے ..... اور میں اس بھری پری دنیا میں تنہا رہ گئی۔ اتنی تنہا کہ جس کا قسم کھانے کو بھی کوئی نہ باقی رہا تھا۔

گھر میں کون آیا، کون گیا۔ بابا کی آخری تیاریاں کس طرح ہوئیں۔ کس نے کی ..... سب کی لحدیں کھودنے والے کی اپنی لحد کس نے کھودی ...... مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹی تو بستی کی چند عورتیں میرے ارد گرد گھیرا بنائے بیٹھی تھیں اور ایک موٹی سی کالی عورت میرا سر اپنے زانو پر رکھے بیٹھی تھی۔

ایسے میں جب کہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اپنا آپ پیٹ پیٹ کر رو دوں، وہ عورت عجیب عجیب بیگانہ حرکتیں کر رہی تھی۔ کبھی دودھ کا پیالہ میرے منہ سے لگاتی۔ کبھی آم کھانے کا اصرار کرنے لگتی اور تو اور روٹیوں پر مکھن چپڑ کر لے آئی کہ "میں یہ خاص طور پر تیرے لیے پکا کر لائی ہوں۔"

حالاں کہ وہ میری بھلائی کی خاطر سب کچھ کر رہی تھی، مگر پتا نہیں کیوں مجھے اُس کے اندر سے چاپلوسی اور فریب کی بو آ رہی تھی۔ مجھے میری چھٹی حس پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔ "یہ بہ ظاہر کچھ اور اندر سے کچھ ہے مگر یہ ہے کون؟" جلد ہی یہ بھید بھی کھل گیا۔ وہ ماکھے کی اماں تھی۔ خود ماکھے کو بھی میں نے بڑی مصروفیت اور سرگرمی کے عالم میں اندر باہر آتے جاتے دیکھا۔

کسی سمجھ نہ آنے والے اسرار کا خدشہ مجھے سہا گیا اور میں رونا بھول گئی۔ میرے بہنے کو بے قرار آنسو خشک ہو گئے۔

آج میرے بابا کے قل تھے۔ لیکن نئے نئے اندیشوں کے زہریلے ناگ

میرے آس پاس پھنکار رہے تھے اور میں کھل کر رو نہ سکی۔ بستی کی عورتیں بتا رہی تھیں۔

"تیرے بابا کے صندوق سے بہت کچھ ملا۔ بہت سے چاندی کے گہنے بھی اور نقد روپیہ بھی۔ اُس کے کفن دفن اور دیگر اخراجات کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہیں آئی۔ سب کام بہت خوبی سے اُسی کی محنت کی حلال کمائی سے انجام کو پہنچے۔"

لیکن مجھے اپنا انجام بہت مشکوک نظر آ رہا تھا۔ مجھے یاد آیا ماکھے نے بابا کو اپنی ماں کے متعلق یہی تو کہا تھا۔ "اُسے ایک ہفتے سے بخار آ رہا ہے۔" مگر مجھے تو وہ بستی کی عورت کسی طرف سے بیمار نہ لگی تھی۔ اس چھوٹے جھوٹ نے مجھے مزید متفکر کر دیا۔

شام سے پہلے بستی کی کچھ عورتیں مزید آ گئیں اور گھر آنگن بھرا بھرا سا لگنے لگا لیکن اصل میں میرے بابا کے بغیر یہ گھر خالی ہو چکا تھا۔ عورتیں املی اور کھجور کی گٹھلیوں پر کلمہ شریف بابا کے ایصال ثواب کے لیے پڑھ رہی تھیں اور میں کونے میں سر نہوڑے بیٹھی تھی۔ دل زندگی اور زندگی کے تمام لوازمات سمیت ہر طرح کے عذاب ثواب سے منکر سا ہو رہا تھا۔ جوں جوں برسات کی کالی اندھیاری رات سر پر آ رہی تھی میرا ہولوں سے بُرا حال تھا۔ مجھے معلوم تھا شام گہری پڑتے پڑتے بستی کی یہ ہمدرد اور سادہ دل عورتیں اپنے اپنے گھروں کو چلی جائیں گی اور پھر..... آگے ماکھے اور اُس کی ماں کی صورتیں ڈراؤنے بھوتوں کی مانند آنکھوں کے سامنے گڈمڈ ہونے لگتیں۔ ان دونوں کے انداز بہت کچھ سمجھا رہے تھے۔ دل ہی دل میں مجھے یقین کامل تھا کہ اُنہوں نے اب یہیں مستقل ڈیرے ڈال دیے ہیں۔ مشکل ہے جواب یہ یہاں سے ٹلیں۔

"یا مولا! میں جاؤں تو کہاں جاؤں؟" اپنے اس سوال سے میری روح بلبلا اٹھی۔ "بابا! آپ مجھے اکیلی چھوڑ کر منوں مٹی تلے کیوں جا سوئے؟"

میں وحشت زدہ ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اچانک حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

میں خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتی تھی کہ اُس شان دار جیپ والے اجنبی کو کبھی دوبارہ دیکھ سکوں گی! اور وہ بھی خود اپنے جھونپڑے میں! میرے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے۔ لیکن یہ اٹل حقیقت تھی کہ وہ باوقار بارعب شخصیت جن کے قدموں میں ایک جلتی دوپہر میں میرے تمام پیلو نچھاور ہو گئے تھے میرے سامنے کھڑے تھے۔ اُن کے ساتھ تین چار مرد اور بھی تھے۔ آج بھی وہ سفید براق لباس پہنے تھے مگر چہرے پر اس وقت مسکراہٹ کے بجائے گہری سنجیدگی اور متانت کی چھاپ تھی۔ ان کی آنکھوں میں جیسے دیے جل رہے تھے اور نگاہیں میرے میلے کچیلے حلیے پر گڑی تھیں۔ میں نے اُن کے ہونٹ ضرور ہلتے دیکھے مگر سنائی کچھ نہ دیا۔ چہرے کے دل گداز تاثرات اور نرم و ملائم انداز نے سمجھایا کہ وہ ضرور ہمدردی کے بول بول رہے ہوں گے۔ یہی ہمدردی اور غم گساری جو خود بہ خود دل میں جگہ بناتی ہے۔

میں سر سے پاؤں تک سراپا آنسو بن گئی۔

دل کی گہرائیوں سے ایک ہوک اٹھی۔ میں اپنے آپ میں نہ رہی اور دوڑ کر اُن کے قدموں میں بکھر گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ من جو کچے پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ پھوٹ بہا۔ میرے ساتھ ساتھ بستی کی ہر عورت رو رہی تھی۔ لگتا تھا آج آنکھوں کے سیلاب میں میری بستی بہہ جائے گی۔ میری بے قراری اور آہ و زاری سے شاید گھبرا کر وہ جلدی سے میرے قریب زمین پر بیٹھ رہے۔

اور پھر دیکھنے والی آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ اُنہوں نے کسی کی پروا کیے بغیر اپنے گرم ہاتھوں کے کٹورے میں میرا چہرہ تھام لیا اور بہت پرسوز لہجے میں کہنے لگے۔

"اللہ! ان آنسوؤں کو روک لو.... ہم نے آج تک کسی کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ آنسو ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں۔ بس یہ بتاؤ کہ ہم تمہارے لیے کیا کریں، تم کیا چاہتی ہو؟"

مجھے بے اختیار وہ پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ جب میرے پیلو گرے دیکھ کر انہوں نے اسی ہمدردی سے پوچھا تھا: "پھل.... اگر کہیں ملتے ہوں تو خرید کر دے دیں" اور اس دن میں نے جلدی سے انکار کر دیا تھا مگر دونوں ملاقاتوں میں زمین آسمان کا فرق حائل تھا۔

اس دن میں باپ کے سائے تلے بے فکر، بے خبر اور ہر سوچ سے آزاد ہرنی کی مانند چوکڑیاں بھرتی پھرتی تھی اور آج مستقبل کے اندیشوں میں گھری ہوئی یتیم لڑکی تھی۔ ہاں! آج میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔

مگر زبان سے پھوٹی بھی کیا!

ایک کے بعد ایک آنسو ٹوٹی مالا کی طرح رخساروں پر بہا کیے اور میں ٹکر ٹکر ان کی صورت تکا کی۔ تب وہ بے قرار ہو کر کھڑے ہو گئے اور سب عورتوں سے مخاطب ہوئے۔

"آپ لوگوں میں کوئی بھی اس کی چچی، تائی، خالہ، ممانی، پھوپھی یا کوئی دوسرا رشتہ دار موجود ہے؟"

ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ سچ ہے میرا کون سگا عزیز موجود تھا جو کوئی بولتا۔ اب حیران ہوئے۔

بے یقینی کے لہجے میں پوچھا۔ "کیا واقعی یہ دنیا میں یکہ و تنہا رہ گئی ہے۔"

کسی نے ان کے سوال کا جواب نہ دیا۔ سب ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے۔ انہی لمحات میں ماکھے اور اس کی ماں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی صلاح

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

یا پھر ماں آپ ہی آپ اونچی آواز میں بولنے لگی۔

"خدا نہ کرے مریاں دنیا میں اکیلی رہ جائے۔ ہم کیا مر گئے ہیں اس کے لیے۔ جاتے وقت بابا خوشیے نے اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر کہا تھا۔ "میری بچی خدا کے بعد تیرے حوالے۔""

میں ہکا بکا رہ گئی۔ ہر کوئی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ لیکن وہ بڑی ڈھٹائی اور اطمینان سے اپنی بات پر بضد تھی۔ ماکھا بڑھ بڑھ کر اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔ میرے اندر کوئی چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ "یہ عورت کوئی چال چل رہی ہے۔" کچھ دیر اسی طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ سب اپنی اپنی ہانک رہے تھے۔ انہوں نے سب کو خاموش کرایا پھر براہ راست مجھ سے پوچھا۔

"تم.... کیا کہتی ہو اس بارے میں؟"

"مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔" میں رونے لگی۔ "نہ ہی میرے بابا نے مجھے کبھی کچھ بتایا۔ اس عورت کو تو میں نے آج ہی پہلی بار دیکھا ہے۔ اس کا بیٹا چند مہینوں سے بابا کے پاس کام کرنے آنا شروع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتی۔"

میرے اس بیان کی تصدیق بستی کے کئی مرد و زن نے کر دی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ماکھے اور اس کی ماں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اس بے پر کی اڑانے پر انہیں جان بچانی مشکل ہو گئی۔ حالات یک لخت پلٹا کھا گئے تھے۔ میں اگر بروقت منہ کھول کر سچ نہ کہتی تو یقیناً ماکھے اور اس کی ماں کے رحم و کرم تلے دبی دبائی پڑی رہ جاتی۔ لیکن اب بستی کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بابا خوشیے کی بیٹی کے کس طور کام آئیں کہ اس بچی کی مشکل بھی ٹل جائے اور اس کا مستقبل بھی سنور جائے جو واقعی اب بے آسرا تھی۔ اور پھر.... قدرت نے نرالا کھیل کھیلا۔ آسمان نے وہ نظارہ دیکھا جو

بہت کم کم دیکھا ہوگا۔ اُدھر عصر کے بعد بابا کے سوئم کی فاتحہ ہوئی اور اِدھر مغرب
ساتھ ہی میرا نکاح ہوگیا۔ اُسی جیپ والے اجنبی سے۔ پل بھر میں، میں کچھ سے کچھ
گئی۔ مجھے میری حیثیت اور میری بساط سے بڑھ کر مل گیا تھا۔ بستی والے خوش بھی
حیران بھی۔

سب نے مجھے اپنے ہاتھوں اُسی شان دار جیپ میں بٹھا کر رخصت کر دیا۔
ڈھولک بجی نہ اُبٹن لگا' نہ مہندی لگی' نہ سکھیوں نے وداعی کے گیت گائے اور نہ
بنی۔ ہاں شادی ہوگئی۔

کسی نے ٹرنک ٹٹول کر دھلا ہوا ایک جوڑا نکال کر پہننے کو دیا تھا' وہی پہن
رخصت ہوگئی۔ شہنائیاں کاہے کی بجتیں؟ نہ کوئی بھیا تھا نہ میاں باپ۔ ہاں بستی وا
نیک دل لوگوں کی سیکڑوں دعائیں ساتھ تھیں۔

کیسا سماں تھا وہ بیٹا! میرے پاس الفاظ نہیں کہ بیان کرسکوں۔ کبھی خواب
بھی ایسی صورت حال کا گمان نہ گزرا تھا۔ وہ قبرستان جہاں بہن بھائی اور ماں باپ
ابدی نیند سوئے ہوئے تھے' وہ بستی' وہ ماحول' وہ ہوائیں وہ فضائیں' حسرت
آخری بار دیکھتے ہوئے چھوڑ دیں۔

آگے کی زندگی ہوا کا ایک خوشبو بھرا جھونکا بن کر گزرنے لگی۔ تم لوگ یہ حقیقت
جان کر شاید یقین نہ کرو کہ وہ اپنے علاقے کے نواب تھے۔ صرف ہم دردی اور
تماشا جذبۂ رحم سے مغلوب ہو کر مجھ سے نکاح کر بیٹھے تھے ورنہ سچ تو یہ تھا کہ وہ
گھرانے میں بظاہر اس وقت کنوارے ہی تھے جب کہ میں اُن کی بیوی بن چکی تھی
میری بچی' جو میری اور ان کی پہلی بچی تھی اور جس کا نام انہوں نے خود بصد شوق "شاہ
جہاں بیگم" رکھا تھا شاید دو سال کی تھی جب ان کی شادی اُن کے اپنے خاندان میں
ان کی تو اپنی شان کے ساتھ ہوئی۔ مجھے یہ معلومات خود اُنہی کی زبانی ملا کرتی تھیں' کیا

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

بھی انہوں نے اپنے اصل علاقے اور خاندان سے کوسوں دور بڑے خفیہ طور سے
تھا۔ یوں مجھے اور شاہدہ کو کوئی تنگی تکلیف نہ تھی۔ رہائشی مکان میرے نام تھا۔
بات کھلے ہاتھ سے دیتے۔ کوئی ملازم وغیرہ میں نے اپنی مرضی سے کبھی نہ رکھا۔
دو ماں بچی کا کام ہی کتنا ہوتا! شادی کے بعد تو کبھی کبھار ہی آتے رہے۔ میری
بہت سے زیادہ ملا تھا اس لیے میں نے کبھی ناشکری نہیں کی۔ مجھے میری اوقات ہر
دم یاد رہی۔ میں نے اُن سے کبھی الٹی سیدھی فرمائش یا مطالبہ نہ کیا۔ انہوں نے
مجھے فرش سے اُٹھا کر عرش پر پہنچا دیا تھا۔ اپنی زندگی میں "مریاں" کے بجائے
رانی" کہہ کر پکارا۔

میرا اُن کا ساتھ ہی کتنا رہا؟ بس چند سال اور پھر دوبارہ "مریاں" بن گئی اور اُن
"شاہ جہاں بیگم" شاہدہ ہو گئی۔ بیٹا! جس شریف النفس انسان نے مجھے اپنے نام
منسوب کیا تھا میں بھلا بعد اُن کے انتقال کے اُن کے نام کو دھبا لگاتی؟ نہ بیٹا نہ
احسان فراموش ہرگز نہیں۔ جب وہ ہی نہ رہے جو دراصل ہمارا سائبان تھے تو پھر
کس سے کرنے جاتی۔ اگر ہماری قسمتوں میں روزِ اول سے خواری اور سیاہ بختی نہ
لکھی ہوتی تو ان کی زندگی وفا نہ کر جاتی! مجھے تو دنوں اُن کی موت کی خبر نہ ہوئی۔ بہت
میں معلوم ہوا کہ بالکل اچانک ہی حرکت قلب بند ہو گئی تھی۔ کسی سے پوچھ کہہ بھی
سکے لیکن ہمارے نکاح کی بات نہیں کیسے ان کے بہنوئی کو بھنک مل گئی۔ بس بقیہ قصہ
انہی کے ہاتھوں ہوا۔ ظاہر ہے ان کو بہت اندیشے ہو سکتے تھے مجھ سے۔ خطرے کا
احساس ہوتے ہی راتوں رات شاہدہ اور میں اپنی جان بچا کر نکل آئی۔ کچھ عرصہ
بستی میں بھی رہی لیکن پیٹ تو اپنا ایندھن مانگتا ہے نا! بھرتی بھراتی ان بیگم صاحب
سے ٹکرائی۔ اللہ ان کو نیکی دے۔ اب تو سوچ لیا ہے عمر کا باقی حصہ یہیں پڑے
گزار دوں گی۔" وہ ایک لمبا سانس لے کر خاموش ہو گئیں۔ آنکھوں سے ساون

بھادوں کی جھڑی لگی تھی۔ جسے وہ دوپٹے کے پلو سے خشک کرنے لگیں۔

علی اور رانی چونک کر حال کی دنیا میں آ گئے۔ جیسے طلسم ٹوٹ گیا ہو۔ را
دونوں ہاتھ بے جان سے ہو کر اُس کی گود میں پڑے تھے اور کتاب چھوٹ کر بیچ
جا گری تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ماسی مریاں کے ساتھ اُن کے ماضی
کوچے گھوم آئی ہو۔ باوجود کوشش کے اُس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا اُ
پیاس کا احساس ہوا اُس نے جھک کر کتاب بنچ سے اُٹھائی اور اُٹھ کر گھر
چلی گئی۔

ماسی مریاں کی داستانِ حیات سے علی بھی بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ اتنی دو
کا کچھ احساس ہی نہ ہوا تھا۔ دوپہر کا سماں گہری پڑتی شام میں تبدیل ہو رہا تھا
اس سے پہلے کہ رانی، واپس آتی، علی نے ماسی مریاں کی طرف جھک ک
راز داری سے پوچھا۔ "آپ نے اُن نواب صاحب کا نام نہیں بتایا۔"

"نواب ذوالفقار علی خاں۔" ماسی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"ایں؟" علی پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں
لگے۔



For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

رمضو اماں بی سے ہدایات لے کر بازار سودا سلف لانے کے لیے نکلا ہی تھا کہ
ن پر ہارن کی تیز آواز گونجی، اس کے ساتھ ہی شرمین بری طرح بھاگتی ہوئی، ہانپتی
تی اندر داخل ہوئی اور اماں بی کا شانہ ہلا کر بے صبری سے بولی۔ "اماں بی......
بی! ابو آ رہے ہیں ابو!...... میں نے ابھی ابھی انہیں گاڑی سے اُترتے دیکھا
...... وہ دیکھیے، وہ ادھر ہی آ رہے ہیں...... وہ اندر آ رہے ہیں......"

جلت میں یہ ساری کمنٹری نشر کر کے خود بیڈ پر رانی سے چپک کر بیٹھ رہی۔ گو کہ ابو
کے ایکسیڈنٹ کے بعد دو بار آ چکے تھے اور اُن کا اس وقت بھی آنا کچھ ایسا حیرت
امر بھی نہ تھا، اس لیے رانی کو اُس کے چیخنے پر ہنسی آ گئی۔ جانتی تھی اس کا مقصد
ے اماں بی کو باخبر کرنا ہے۔ اور یہی ہوا۔ اماں بی دوپٹا درست کرتی ہوئی جلدی
ی کمرے سے نکل گئیں۔ ابو بہت سارے فروٹ اور دیگر اشیا کے پیکٹوں سے
ے پھندے اندر داخل ہوئے تو دونوں بہنوں نے آداب کیا۔ رانی نے محسوس کیا
ج کچھ فکرمند اور سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اماں بی نے ٹرالی بھر کر بہت سے
نے پینے کے لوازمات بھیج دیے تھے۔ وہ سیب لیتے ہوئے بظاہر باتیں کر رہے
مر دھیان کہیں اور تھا۔

شرمین کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُٹھ کر ان کی گود میں سما جاتی مگر وہ بیٹھی و
ور سے صرف پُرشوق نظروں سے انہیں دیکھے جا رہی تھی بے انتہا محبت اور
ے۔

کافی دیر کے بعد ابو نے ایک طویل سانس لی پھر چائے کا کپ رکھتے
رانی کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

"بیٹے! آج میں آپ کے پاس بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔ زندگی
سے زیادہ اہم ترین دن۔ آپ ماشاءاللہ بہت سمجھدار اور سلجھے ہوئے خیالات
ہیں اور جن کڑے حالات میں آپ نے وقت گزارا میری نگاہوں سے پوشیدہ
رہے۔ میں نے ہر آن دونوں کو دل کے قریب پایا ہے آخر میری اولاد ہو
دونوں۔ مگر میں آج اعتراف کرتا ہوں کہ میں صحیح معنوں میں اپنا فرض ادا نہ کر
سکا آپ کی حد سے بڑھی ہوئی ضد اور ہٹ دھرمی بھی میری راہ اور ہمارے
درمیان حائل رہی ہے۔ مگر اب مجھے پورا یقین ہے کہ جو میں کروں گا اور کہوں گا
اُسی پر عمل کریں گی۔ نیک اور اچھی بچیوں کی طرح۔ دیکھیے بیٹی!" انہوں نے
ادھوری چھوڑ کر سگار سلگایا پھر ایک کش لے کر دوبارہ بولے۔ "بیٹیاں بڑے
شاہوں کی بھی سدا بیٹھی نہیں رہتیں۔ والدین کا گھر بیٹی کا عارضی ٹھکانا ہوتا
بالآخر ایک نہ ایک دن اُسے اپنی اصلی پناہ گاہ میں جانا ہوتا ہے۔ جب تک آپ
تھیں میں نے آپ کی ہر جا و بے جا ضد کو تسلیم کیا مگر اب ایسا ممکن نہیں ہے۔
خیال میں اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ میں آپ کے مستقبل کا فیصلہ کر ڈالوں ا
کو باعزت طریقے سے رخصت کر دوں چناں چہ میں چاہتا ہوں کہ ایک
حیثیت سے میرے انتخاب پر پورا بھروسا کریں۔

رانی کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

انہوں نے اُس کے پسینے سے تر چہرے سے نظر ہٹا کر دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"بیٹے! آپ کو معلوم ہے آج کل انسان کی اوسط عمر کیا ہے؟ تو کیوں نہ ہم زندگی کے
ان مختصر سے وقفے کو اس کے حقیقی لطف سے محظوظ ہوتے ہوئے گزاریں؟ مرنے کے
بعد بھی کوئی واپس اس دنیا میں آتا ہے؟ تو پھر ہمیں اس چند روزہ زندگی کو بے کار قسم کی
الجھنوں اور اندیشوں کی نذر کرنے کے بجائے بھرپور انجوائے کرنا چاہیے اور میرے
خیال میں زندگی کا سچا مزہ وہی لوگ لے سکتے ہیں جو مال و دولت کی نعمت سے مالا مال
ہوتے ہیں۔ پیسہ اس دنیا کی عظیم طاقت اور سب سے بڑا موثر ہتھیار ہے۔ بیٹے! پیسہ
آسائش و آرام سکون اور انسانی خواہشات کی تکمیل کا واحد ذریعہ ہے تو اس کو ٹھوکر
مارنے والے خوش نصیب نہیں کہلا سکتے۔ میں تو ایسے ہی خیالات کا مالک ہوں چناں
چہ ایسے ہی اوصاف کے مالک' مضبوط کریکٹر اور اعلیٰ اسٹیٹس کے مالک ایک شخص کا
انتخاب آپ کے لیے کیا ہے جو ہر لحاظ سے آپ کے لیے انتہائی موزوں اور مناسب
ہے۔ میرا بہترین دوست ہے زبیر علی۔ اپنے وسیع اور ذاتی کاروبار کا مالک ہے۔ آپ
تصویر دیکھ سکتی ہیں۔ شام چھ بجے میں فون پر آپ کا جواب پوچھوں گا۔"

انہوں نے پرس سے ایک کارڈ سائز تصویر نکال کر میز پر رکھی اور ادھر اُدھر دیکھے
باہر چلے گئے۔

وقت رُک رُک کر گزرا۔

زندگی کے جس موڑ کا اُس نے ابھی تک تصور بھی نہیں کیا تھا' اُسے ایک فیصلہ کن
مرحلے سے گزار کر ایک حقیقت بنا کر اس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا تھا۔

یہ لمحہ اور یہ فیصلہ اُس کے لیے گزشتہ تمام فیصلوں سے زیادہ کڑا' مشکل اور صبر
آزما تھا۔ اُس پر ابو کے خیالات اور فلسفۂ حیات غصہ' جھلاہٹ اور دُکھ بیک وقت اُس
کے دماغ پر ٹھوکریں رسید کرنے لگے۔ صبح سے اب تک اُس نے ایک بار بھی زبیر علی

کی تصویر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ابو نے لفظوں میں جو اُس کی تصویر اور نقشہ

کھینچا تھا' رانی کے لیے وہ ہی کافی تھا۔

سوچتے سوچتے دل و دماغ ویران مرگھٹ بن گئے۔

شام کے وقت اُس میں اتنی ہمت بھی نہ رہ گئی کہ وہ ابو کا نمبر ملا سکتی۔ تھوڑی دیر

بعد ابو نے خود ہی رنگ کیا۔

''مجھے ...... وہ پرپوزل قطعی نامنظور ہے۔'' سارا دن مختلف زاویوں سے سوچی

ہوئی بات اُس نے ایک ہی جملے میں کہہ ڈالی اور کہہ کر اپنی جرأت اور حوصلے پر حیران

رہ گئی۔

''رانی! یہ کیا بک رہی ہے۔'' ابو نے زندگی میں پہلی بار اُسے نام لے کر

غصے سے اُن کی آواز پھٹ گئی اور وہ ریسور میں کھانسنے لگے۔ فقط ایک ہی بات کہہ کر

رانی خاموش ہو گئی تھی جیسے قوت گویائی سلب ہو گئی ہو۔

''بکو ...... کیا بک رہی تھیں تم؟'' ابو کو شدید غصہ تھا۔

اُن کے بار بار ''ہیلو ...... ہیلو ......'' کہنے پر اُس نے اپنے منتشر حواس یکجا

کیے جا کیے اور بکھی بکھی آواز میں بولی۔ ''ابو ...... مجھے آپ ڈانٹ ڈپٹ کر زبردستی

کیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ میں سچی بات نہ کہہ سکوں ...... ابو! دراصل میں نہیں چاہتی کہ

تاریخ ایک بار پھر خود کو دہرائے۔ میری بے باکی کو معاف فرمایئے گا' آپ کی اور

امی کی بے جوڑ زندگی' ہمارا سارا کیریئر' اعتماد اور اطمینان چھین لے گئی ہے۔ کیا ہمارا

ایک نارمل گھرانا نہ ہوتا اگر آپ دونوں میں خیالات ملتے اور سوچوں کا تضاد نہ

ہوتا! آپ نے زندگی کو جس نظریے کے ساتھ میرے سامنے بیان کیا' وہ مجھے

مجبور کرتا ہے کہ اپنے والدین کے نقش قدم پر ہرگز نہ چلوں تاکہ نئی مثالیں قائم نہ ہوں۔

یہ سب آپ ہی نے مجھے دیا ہے ابو! میں سمجھتی ہوں دو فریقین کے خیالات کا اختلاف

ہماری انسانی زندگی پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتا ہے اور زندگی کو ایک مسلسل و مستقل

عذاب میں مبتلا رکھتا ہے۔ جہاں آپس کی انڈر اسٹینڈنگ مفقود ہو وہاں دل و دماغ

نارمل رہ سکتے ہیں بھلا! اور پھر سب آپ کی طرح آہنی اعصاب کے مالک تو نہیں ہو

سکتے! ستم تو یہ ہے کہ جہاں زندگی کسی پرابلم کا شکار ہو جائے وہاں گھاٹے کا سودا بھی

عورت کا مقدر بنتا ہے۔ مرد صاف بری ہو جاتا ہے جس طرح آپ اور اماں بی! ......''

''او شٹ اَپ ...... '' وہ پوری قوت سے دھاڑے۔ ''تمہیں یہ سب غلط خیالات

تمہاری ماں کی طرف سے ملے ہیں۔ تم دونوں پاگل اور جاہل ہو۔ یاد رکھو۔ یہ زندگی کا

بہترین چانس گنوا کر تم ہمیشہ اپنی ماں کی طرح پچھتاؤ گی۔

''جی نہیں ابو! ایسا انشاء اللہ ہرگز نہیں ہو گا۔'' رانی نے بڑے صبر و تحمل سے جواب

دیا۔ ''آپ انسانی زندگی کو دولت کے ترازو اور ذہنی ہم آہنگی کو سونے چاندی کی جھنکار

میں تول رہے ہیں۔ سوداگر تو ہم بھی ہیں' مگر ...... خلوص' نیک نیتی' قناعت' صبر اور

صاف ستھرے سادہ پاکیزہ خیالات کی ہم آہنگی کے ......'' اتنا کہہ کر رانی نے فون

کریڈل پر رکھ کر ایک طویل سانس لی اور تھکے ماندے مسافر کی طرح وہیں کرسی پر

ڈھیر ہو گئی۔

''ہیلو! سنا ہے آپ کا جشن شادی خانہ آبادی منعقد ہونے والا ہے؟'' علی نے

اچانک نمودار ہو کر اُسے مزید اَپ سیٹ کر دیا۔

جانے کیوں آج وہ ''تم'' سے ''آپ'' پر آ گئے تھے جیسے پہلی بار ملے ہوں یا اُس

سے کوئی خطا سرزد ہو گئی ہو۔

''آپ کو کس نے بتایا؟'' اُس نے اُلجھ کر پوچھا۔

''ہماری خاص سی آئی ڈی نے۔'' انہوں نے شرمین کی طرف اشارہ کیا۔ رانی

نے جواب دیے بغیر شرمین کو گھور کر دیکھا' وہ زور زور سے قہقہے لگانے' اور دھپ دھپ

بیر مارتی، باہر بھاگ گئی۔

"کیا یہ سچ ہے؟" علی نے پرسکون انداز میں دریافت کیا۔

"آپ سے مطلب؟" وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

وہ متحیر ہو کر اُسے دیکھنے لگے۔ لیکن ناراضی کے باوجود خاصی دیر وہیں ٹہل ٹہل کر سگریٹ پھونکتے رہے پھر سوچ میں ڈوبے باہر نکل گئے۔



[For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com]

رات اُس نے سوتی جاگتی کیفیت میں بڑے کرب اور تکلیف میں گزاری اور صبح ہوتے ہوتے تیز بخار نے آلیا۔

ایک تو ویسے ہی زبردست اور جان لیوا حادثے سے معجزاتی طور پر بچ نکلی تھی اور اب بیٹھے بٹھائے نئی افتاد آن پڑی تھی۔ پے در پے ذہنی خلفشار اور اذیت ناک سوچوں نے اُسے دوبارہ بیمار کر ڈالا تھا۔

اماں بی کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ ماسی مریاں اور وہ دوڑ دوڑ کر اُس کی تیمارداری کر رہی تھیں۔ دعا اور دوا دونوں جاری تھیں۔ آج کل علی نے بھی آنا ترک کر رکھا تھا۔ ابو ویسے ہی شاید ہمیشہ کے لیے ناراض ہو چکے تھے۔ بدحواسی اور ہول میں یہ دونوں بڑی بوڑھیاں ادھ موئی ہو گئیں۔ اماں بی کو اس مصیبت اور لاچاری کے عالم میں اکیلے اور بے بس ہونے کا احساس مارے ڈالتا تھا۔ شاید لوگ ایسے کڑے وقت کے لیے اچھے شوہروں کی دعائیں مانگا کرتے ہیں ورنہ اولاد کے دُکھ کو تنہا جھیل جانا ایک کمزور اور ناتواں عورت کے لیے کتنی پریشان کن صورت حال کو جنم دیتے ہیں، یہ کوئی اماں بی کے دل سے پوچھتا! وہ تو کہو ماسی مریاں کے وجود سے پھر بھی جی کو

ڈھارس بندھی رہتی۔ ورنہ وہ نڈھال ہو چکی تھیں۔

چند دن کی مسلسل جگار کے بعد خدا خدا کر کے اُس کا بخار ٹوٹا تو ان تینوں نے سکھ کا سانس لیا۔

اس دوران ثمرین کی شرارتیں بھی دم سادھے رہیں۔ جس دن صاحب زادی افروز جہاں یا شاہ جہاں کا فون آ جاتا اُس کی بن آتی۔ کتنی ہی دیر اُن سے گپ شپ میں مصروف رہتی۔ وہ دونوں رانی کو جلد از جلد صحت یاب ہونے کی تلقین کرتیں۔ انہی کی زبانی اُسے معلوم ہوا کہ 9 مارچ کو نواب فیملی کی طرف سے حسبِ معمول "قصر دیدار" کے "گوشہ ارم" میں "جشنِ بہاراں" منایا جا رہا تھا۔ جس میں کالج کی طالبات بھی مختلف اقسام کے رنگا رنگ پھولوں کے اسٹال سجانے والی تھیں۔ یہ ایک انتہائی خوب صورت اور دل چسپ پھولوں کی تقریب ہوا کرتی تھی جو ہر سال موسمِ بہار کے آغاز میں منعقد ہوتی۔ اس تقریب میں کالج اسٹاف کے علاوہ "قصر دیدار" کے مکین اور معززین خاصی تعداد بھی شرکت کرتے تھے۔ عشائیہ نواب فیملی کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ جس کے بعد لوگ ہنستے مسکراتے گھروں کو لوٹ جاتے۔ اسی تقریب میں حصہ لینے والی طالبات کو پہلے دوسرے اور خصوصی انعامات سے نوازا جاتا۔ سب ہر سال اس موقع کے منتظر رہتے۔

رانی تمام تفصیلات سے آگاہ تھی اس لیے صدقِ دل سے دُعا کر رہی تھی کہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہو تاکہ "جشنِ بہاراں" میں شریک ہو سکے۔

پھر اُس کے حوصلے زندہ لوگوں میں زندگی سے بھرپور انداز میں شامل ہونے کی امنگ بہت سارے لوگوں کی بہت سی محبتوں' چاہتوں اور بے پناہ خلوص اور بے ریا سلوک نے اُسے بسترِ علالت سے کھڑے ہو جانے کی توانائی بخش ہی دی۔

چلنے پھرنے کے قابل تو ہو گئی تھی مگر بے پناہ زرد چہرے اور نڈھال صحت کی وجہ

سے اماں بی نے اُسے الٹی میٹم دے دیا تھا کہ "بس اب پیدل چلو۔ گاڑی کو ہاتھ بھی لگانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔" رانی ذاتی طور پر بھی فی الحال اپنے میں اتنی جرأت محسوس نہیں کر رہی تھی کہ ڈرائیونگ کر سکتی۔ اس لیے صاحب زادی افروز جہاں کو فون پر کہہ دیا تھا اور اُس نے 9 مارچ کو گاڑی بھیجنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

"جشنِ بہاراں" میں شرکت کے لیے وہ شام کو تیار ہونے کی غرض سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوئی تو اپنا سراپا دیکھ کر جھجک سی گئی۔ ہلکے میک اپ سے تو آج کام چل جانے کا ایک فی صد بھی امکان نہ تھا۔ چہرے پر چھائی بے تحاشا زردی اور آنکھوں کے حلقے اُسے پریشان کر گئے۔

بیمار تو ہر کوئی ہو جاتا ہے۔ ایکسیڈنٹ بھی ہو سکتا ہے مگر اس کی طرح ویران اور اجاڑ کوئی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی حالت خوب سمجھ رہی تھی اور جانتی تھی کہ وہ اس حد تک ڈاؤن نہ ہوتی اگر ابو سے "زبیر علی" کی وجہ سے رنجش نہ ہوئی ہوتی۔ ساتھ ہی نگاہوں میں علی اور صاحب زادی افروز جہاں کی صورتیں بھی گھوم گئیں۔ دل میں اک انجانی سی خلش کے ساتھ اس نے سوچا۔ "شادی کے تذکرے کے بعد علی نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔" ایک گہری سانس لے کر اُس نے پے در پے چلے آنے والے خیالات کو جھٹکا اور اپنی طرف متوجہ ہو گئی۔

"جشنِ بہاراں" کی نسبت سے اس نے زرد اور عنابی پھولوں کی انتہائی نفیس ساڑی پہنی۔ بال سمیٹ کر بڑے سلیقے اور صفائی سے چہرے کی پیلاہٹ اور آنکھوں کے حلقے چھپائے۔ گلے میں سفید موتیوں کی مالا اور کانوں میں اسی سیٹ کے آویزے ڈال کر اُس نے آئینے پر نظر ڈالی تو خود ہی ہکا بکا رہ گئی۔



"قصرِ دیدار" کے بائیں باغ کا وہ کشادہ اور وسیع لان جو "گوشۂ ارم" کے نام سے مشہور تھا' اُس کے مسحور کن خوشبوؤں والے پھولوں کی بیلوں سے لدے ہوئے گیٹ پر ہی افروز جہاں اور شاہ جہاں نے رانی کو استقبال کیا۔

اُن کے قریب بہت سی خادمائیں چاندی کے بڑے بڑے تھالوں میں سرخ گلابوں کے مہکتے ہوئے ہار لیے کھڑی تھیں اور وہ آنے والی مہمان خواتین کا استقبال ان ہاروں سے کر رہی تھیں اس لیے جب ایک ساتھ کئی ہار رانی کے گلے میں پڑے تو وہ پھولوں میں تقریباً ڈھکی ہوئی پریشان سی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

افروز جہاں اور شاہ جہاں کے نقرئی قہقہے دیکھنے والوں کی مسکراہٹوں میں اضافہ کر رہے تھے۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" زیب النسا بیگم نے آ کر دونوں کو ڈانٹا اور پھولوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی رانی کی پیشانی محبت سے چوم لی اور بہت پیار سے اس کا احوال پوچھنے لگیں۔ پھر دوسری مہمان خواتین کی طرف بڑھ گئیں۔

اُن کے جانے کے بعد رانی نے ان دونوں کو خبر لینے والے انداز میں دیکھا۔ مگر

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

ان سے کچھ نہ بولی۔

افروز جہاں جلدی سے بہن کی طرف دیکھ کر بولی۔ "اللہ شاہ جہاں! لوگ تو بیمار ...زیادہ حسین اور دل ربا ہو جاتے ہیں..... چلو ہم بھی بیمار ہو جائیں!"

شاہ جہاں اُس سے بھی زیادہ شرارت سے آنکھیں نچا کر بولی۔ "ہمارا تو یہ خیال ...وزی کہ اختر شیرانی نے کسی ایسے موقع کے لیے یہ مصرعہ کہا ہوگا کہ۔

مجھے مُرجھائی ہوئی زرد کلیوں سے محبت ہے

دیکھا تم نے مُرجھائی ہوئی زرد کلی کا ستم! واللہ! ہمیں تو رانی اسی مصرعے کی تشریح ...رہی ہے۔"

افروز جہاں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "سچ کہتی ہو تم سے' ایکسیڈنٹ سے ...ل" ہوتے ہوتے یہ مہارانی تو خود ہی "قاتل" بن گئی ہیں۔ اب تو اللہ وارث ہے ...ارا۔"

اتنا کہتے کہتے ذرا سا گھوم کر معنی خیز انداز میں دائیں طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظر ...تعاقب میں دیکھتے دیکھتے رانی اپنی جگہ ساکت رہ گئی گویا پتھر کی بن گئی ہو! بالکل سامنے ہی۔ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس' سیاہ' گھونگریالے بال سلیقے ...سے جمائے علی ایک حسین سی خاتون سے محوِ گفتگو تھے۔

"اوف اوہو فوزی! تم نے رانی بے چاری کو پریشان کر ڈالا۔ وہ ویسے ہی بستر ...لالت سے اُٹھ کر آ رہی ہے۔" شاہ جہاں نے فوراً ہی مداخلت کی پھر رانی کا ہاتھ پکڑ ...ر سنجیدگی سے بولی۔ "چلو رانی! ہم تمہیں دوسری مہمان خواتین سے ملوا دیں۔ یہ فوزی ...ز آج آپے سے باہر ہو رہی ہیں مارے خوشی کے۔"

رانی اُس کے معنی خیز جملوں پر غور کرتی ہوئی اُس کے ساتھ چل دی۔

مہمان خواتین میں معزز ین شہر کے علاوہ زیادہ تعداد اُس کی لیکچررز اور طالبات

کی تھی۔ اُن سب نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اکثریت مزاج پرسی کرنے والوں کی تھی۔ خوب صورت چہرے، مسکراتے ہونٹوں، کھنکتے قہقہوں، زرنگار رنگ ملبوسات اور شریر مسکراہٹوں کے جلو میں "جشنِ بہاراں" کی یہ تقریب گویا اسم با مسمّیٰ لگ رہی تھی۔ خوش رنگ پھولوں کے مہکتے اسٹال، پھولوں کلیوں کی ترتیب، سجاوٹ اور رنگینی سے طالبات کی نفاست، سلیقے اور خوش ذوقی کا اظہار ہو رہا تھا۔

ان تمام تر دلچسپیوں اور گہما گہمی کے باوجود رانی کو اپنا آپ خالی خالی سا لگتا تھا۔

علی اُسے مختلف اوقات میں، مختلف جگہوں پر نظر آئے تھے۔ کئی مرتبہ تو صاحب زادی افروز جہاں کے ساتھ ہنستے مسکراتے دکھائی دیے۔ ایسے موقع پر بے پناہ حیرت، تجسس، تعجب، دکھ اور ایک نہ سمجھ میں آنے والی کیفیت کے زیرِ اثر رانی کے دل کی دھڑکنیں کبھی تیز اور کبھی بالکل سست ہو جاتیں۔

علی اور افروز جہاں سے اپنی علیحدہ علیحدہ دوستی، باتیں اور ملاقاتیں اور اب اُس منظر کا خیال کرتی جو اس نے نیم بے ہوشی میں دیکھا تھا تو مزید اُلجھ کر رہ جاتی۔

یہ سارے نظارے دیکھتے دیکھتے بالآخر اُس کے اعصاب جواب دینے لگے۔ اُسے محسوس ہوا کہ اگر وہ کچھ دیر مزید اسی ہنگامے میں شامل سوچتی رہی تو پاگل ہو جائے گی۔ سب کی نظروں سے بچتی بچاتی وہ ایک گوشۂ تنہائی میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔

خبر نہیں کتنی دیر گزر گئی۔ کئی ملے جلے قہقہے سن کر وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

صاحب زادی افروز جہاں اور شاہ جہاں کے درمیان، علی کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"گوشۂ ارم" کے اس گوشے میں پھولوں کی بیلوں اور جنگلی جھاڑیوں کے سبب

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

ہلکی ہلکی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اس ملگجے اندھیرے میں علی کی اُجلی اُجلی مسکراہٹیں اور افروز جہاں کے دل نشین قہقہے اُسے زہر لگ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے اُٹھ جاتی یا کچھ کہتی، صاحب زادی آگے بڑھی اور بڑی نرمی سے اُس کا ہاتھ تھام کر ڈرامائی انداز میں بولی۔ "رانی! کہاں جا رہی ہو بھئی! اِدھر آؤ --- ان سے ملو، یہ ہیں ہمارے بھیا، صاحب زادہ دیدار علی خاں --- اور بھیا! یہ ہیں ہماری بہت ہی پیاری اور عزیز ---" باقی بات اُس کے منہ میں ہی رہ گئی۔

رانی کھڑے ہوتے ہوئے لہرا گئی تھی۔ پیشتر اس کے کہ وہ نیچے گرتی، صاحب زادہ دیدار علی خاں نے جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سنبھال لیا۔

ایک لمحے کے بعد رانی نے بند ہوتی ہوئی آنکھیں بہ وقت تمام کھولتے ہوئے اُن کی بانہیں بُری طرح جھٹک دیں اور اُن کے بجائے شاہ جہاں پر اپنے جسم کا بوجھ ڈالتے ہوئے پست آواز میں کہا۔ "صاحب زادی مجھے میرے گھر پہنچا دیجیے --- میرا دل ڈوب رہا ہے۔"



صاحبزادی شاہ جہاں کا دل دھک سے رہ گیا۔

رانی کا تو وزن ہی کیا تھا! اُس نے بے اختیار رانی کو دونوں باہوں کے حلقے میں سمیٹ لیا اور بدحواسی و گھبراہٹ کے عالم میں چیخ پڑی۔

"بھیا! بھیا...... دیکھیے اِسے کیا ہو گیا؟"

علی جو اُس کے جھڑک دینے سے پیچھے ہٹ گئے تھے گھبرا کر دوبارہ اُس پر جھک گئے مگر اتنی ہی دیر میں رانی شاہ جہاں کے ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی سبزے پر ڈھیر ہو گئی۔

میں تو اِن معاملات میں بھی ٹوٹنے والی نہ تھی
کونج اپنی ڈار سے یوں چھوٹنے والی نہ تھی
کوئی تو ایسا سبب تھا زندگی کے درمیاں
ورنہ اپنے آپ سے میں رُوٹھنے والی نہ تھی
درد کی آواز مدھم اور مدھم ہو گئی
وہ زمین و آسمان میں گونجنے والی نہ تھی

"گوشۂ ارم" کی مہک آور فضاؤں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مہمان اپنی

اپیوں میں مشغول اِدھر اُدھر ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے مگر پھولوں سے بھرے بے جھکی جھکی ٹہنیوں والے اِس تنہا گوشے میں موجود یہ تینوں بہن بھائی دُکھ اور الی سے ہاتھ مل رہے تھے۔

صاحبزادی افروز جہاں اُسے ہلا جُلا کر بولی۔

"ہائے اللہ بھیا! یہ تو بے ہوش ہو گئی۔"

علی کو بے اختیار اُس کا ایکسیڈنٹ یاد آ گیا۔ اُس روز بھی بے ہوش رانی کو معلوم کس جدوجہد سے اُنھوں نے اسٹرینگ کے درمیان بُری طرح پھنسی ہوئی میں نکالا تھا۔ مگر اُس دن اور آج کے حالات میں واضح فرق تھا۔

اُس روز وہ ایکسیڈنٹ کے صدمے سے زخمی ہو کر بے ہوش ہوئی تھی۔

مگر آج تو...... بظاہر کوئی زخم نظر نہیں آ رہا تھا۔

علی کے حساس دل نے اُس کی اچانک بگڑ جانے والی کیفیت کو پوری طرح ں کیا۔ اُنھیں اپنی بہنوں کے علاوہ خود پر بھی شدید غصہ آیا۔ مذاق ہی مذاق میں غریب کی جان پر بن گئی تھی۔ اُنھوں نے بے سُدھ پڑی رانی کے قریب اکڑوں ہوئے بہنوں کو ہلکی سی ڈانٹ پلا دی۔

"ہٹو اُس کے قریب سے۔ ہوا لگنے دو۔ اور شور مچانے کی کوشش مت کرو"

شاہ جہاں ڈرتے ڈرتے بولی

"بھیا! اِسے کسی طرح...... اندر لے چلیے۔"

"خاموش رہو"

اُنھوں نے سختی سے منع کر دیا۔ پھر ذرا تھم کر بولے۔

"اگر ممکن ہو تو کہیں سے پانی لیکر آؤ۔"

علی کے موڈ سے دونوں سہم سی گئیں۔ اُنھیں چُپ لگ گئی۔ کاہے کو کبھی بھائی سے

ذائقہ کھائی تھی۔ تاہم پانی کی جستجو میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

ہلکی ہلکی تاریکی میں اُجلی اُجلی رانی ابھی تک اپنے آپ سے غافل پڑی تھی

نے پھولوں کی سی نرمی سے اُسے سنبھال کر بنچ پر لٹا دیا اور پریشانی کے عالم میں

رُومال سے اُسے ہوا دینے لگے۔

لے جانے کو تو وہ اسے اندر لے جاتے کسی نہ کسی صورت سب کی نظروں سے

کر۔ لیکن اُس کے الفاظ دل پر نقش ہو چکے تھے۔

"صاحبزادی۔ مجھے میرے گھر پہنچا دیجئے......"

علی اُس کی ضد اور ہٹ دھرمی سے خوب واقف تھے اس لئے مجبور

اندر سے اُن کو سخت ملال تھا۔ حالات پہلے سے بھی زیادہ گھمبیر ہو گئے تھے

خود کو مجرم سمجھ رہے تھے اور دل میں سخت نادم اور شرمسار تھے۔ اُس کی اس

بے ہوشی نے اُن کے حواس مختل کر ڈالے تھے۔ وہ دم بخود تھے کہ اب

کریں؟

مگر جلد ہی قدرت نے اُن کی بے بسی کا بھرم رکھ لیا اور شاہجہاں کا

ہوا پانی ابھی اُنھوں نے اُس کے چہرے پر چھڑکا بھی نہیں تھا کہ اُس

آنکھیں کھول دیں۔ حواس بیدار ہوتے ہی اُس کی ناک سے پھولوں

کلیوں کی بھینی بھینی مست خوشبو ٹکرائی' جس نے عمدہ اثر ڈالا۔ تاہم مدہم

اُجالے اور تاریکی کے سنگم نے شناخت کی صلاحیت کو تھوڑی تک سُن

رکھا۔

"مم...... میں کہاں ہوں؟"

اُس کے منہ سے مبہم سے الفاظ نکلے۔ علی جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔

دونوں اُس پر جھک گئیں۔ شاہ جہاں خوش ہو کر بولی۔

"مولا تیرا شکر ہے یہ ہوش میں تو آئی۔"

افروز جہاں محبت سے اُس کے پسینے پسینے ہوتے چہرے پر ہاتھ پھیر کر بولی'

"رانی! یہ کیا پتہ چلا ہے! اٹھو بھی۔ یہ کیا۔ باتیں کرتے کرتے ہی سو گئیں۔

اچھی نیند۔ لو یہ پانی پی لو۔"

افروز کی آواز سن کر وہ واقعی اُٹھ بیٹھی اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

اُسے دکھائی نہ دیئے تاہم پانی پی لیا اُس نے۔ خشکی سے حلق کھچ رہا تھا۔ اتنی ہی

ل ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔

حواس بحال ہوئے تو عقل ٹھکانے آئی۔ اصل قصہ ذہن میں تازہ ہوا تو دل تیزی

ی سے دھڑکنے لگا۔

ایک دفعہ پھر وہ غور سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ جیسے کسی کی متلاشی ہو...... تبھی نگاہ

ل کر رہ گئی۔

سوچیے کے باغ و بہار کنج میں علی کھڑے سگریٹ سلگا رہے تھے۔ پوری حقیقت

روز روشن کی طرح واضح ہوتی چلی گئی۔

اُس کی تیوری چڑھ گئی۔ اُدھر سے رُخ پھیر کر شاہ جہاں سے کہا۔

"براہِ کرم اپنے ڈرائیور سے کہیئے وہ مجھے میرے گھر چھوڑ آئے۔"

"ہاں ہاں۔ بھئی چلی جانا۔"

افروز نے فوراً اُسے دلاسہ دیا۔

"ابھی تو وقت ہی کیا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر یہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

"کیوں؟ یہاں کیوں؟"

اُس نے تیوری پر بل ڈالے ڈالے تنک کر پوچھا۔

"مجھے نہیں بیٹھنا یہاں۔"

مارے جھلاہٹ کے وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوگئی۔

"ارے..... ارے"

وہ دونوں بوکھلا کے اُس کے اردگرد آ گئیں۔ شاہ جہاں کی زبان سے نکلا

"ابھی ذرا دیر قبل دشمنوں کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اب ذ
بیوقوفی دیکھو۔ نہیں بھئی نہیں اس وقت ہم تمہیں کہیں نہیں بھیجیں گے۔ سید
ہماری خوابگاہ میں چل کر آرام کرو۔"

"کہہ دیا نہ میں اپنے گھر جاؤں گی بس۔"

اُس نے بدستور بگڑے بگڑے تیور سے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر آپ لوگوں کو بھیجنا منظور نہیں تو میں بس سے چلی جاؤں
وہ جوش ہی جوش میں اُن دونوں کے حلقے سے نکل کر چند قدم آگے بڑھ
راہ میں علی کھڑے تھے۔ غم و غصے کی زیادتی سے وہ پوری جان سے کانپ
مگر شکست مان لینے والوں میں سے وہ بھی نہ تھی۔ سانس دھونکنی کی طرح چل
محسوس کر رہی تھی کہ اگر مزید اِن لوگوں کے درمیان رہی...... تو شاید
تیورا کر گر پڑے گی۔

علی اُس کی کیفیت سے ڈر گئے۔

"شاہ جہاں!"

اُنھوں نے دھیرے سے بہن کو مخاطب کر کے کہا۔

"ڈرائیور گاڑی لگا رہا ہے۔ اِن کو سوار کرا دو۔"

وہ ہدایت دے کر ہوا کے جھونکے کی طرح غائب ہو گئے۔

تھوڑی دیر میں "قصرِ دیدار" کے شاندار پھاٹک سے ایک کار رانی کو لیے ہوئے نکلی تو اُس کے تعاقب میں چپکے سے دوسری گاڑی بھی حرکت میں آ چکی تھی، جسے صاحبزادہ دیدار علی خان ڈرائیو کر رہے تھے۔

اُنھوں نے رانی کی شرط تو پوری کر دی تھی مگر...... اپنی تمنا بھی پوری کر لی تھی۔



گھر پہنچ کر رانی کی پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی...... وہ اپنی ضد کی بنا
پہ نکلی اور ڈرائیور کے ساتھ اکیلی ہی آئی تھی۔ زیب النساء بیگم سے اجازت لینے
ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی اُس نے اب اُن تینوں نے اِس بارے میں انہیں کیا کہ
مطمئن کیا ہوگا؟ رانی کو پرواہ نہ رہی تھی۔ بس اچانک ہی غم و غصے کے زیرِ اثر اُس
سارے فیوز اُڑ گئے تھے۔

کئی گھنٹے مسلسل غور و فکر کے بعد اُس کی حیرت قدرے کم ہوئی اور صدمے کا
زائل ہوا تو اُسے اپنی بزدلی اور اعصاب کی کمزوری پر شدید غصہ آنے لگا۔ آخر
کیوں اتنی کمزور طبیعت ہو گئی ہے کہ خواہ تھوڑی دیر کیلئے سہی کیوں اپنے ہوش و حوا
پر کنٹرول نہ رکھ سکی! وہ جھنجلا جھنجلا کر سوچنے لگی

"بھلا بے ہوش ہو جانے کی کیا تک تھی؟ ایسا کیا تھا؟ دیکھ لیا تھا
نے؟ اگر اسی طرح وہ ہر حادثے ہر واقعے اور ہر ہر تلخی کو محسوس کرتی ر
تو اِس دنیا میں رہنے کے قابل ہی کب رہ جائے گی! بے حس لوگ یو
احساسات سے کھیلتے اور جذبات کو روندتے گزرتے رہیں گے...... اللہ میر

آ...!"

تھوڑی دیر بے چینی سے کروٹیں بدلنے کے بعد وہ بستر پر اُٹھ بیٹھی۔
پوری کوٹھی پر گہرا سناٹا طاری تھا۔
ذہن کے دریچے پر آج شام کا واقعہ اپنی پوری جزئیات کے ساتھ دستک دینے
لگا۔ وہ تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر ایک استغراق کے عالم میں بیٹھ گئی۔
کس قدر حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین حقیقت پر سے پردہ اُٹھا تھا۔ یعنی علی محض
علی نہیں دراصل صاحبزادہ دیدار علی خاں تھے!
اُن تینوں نے مل کر کتنا طویل ڈرامہ رچایا تھا اُس کے ساتھ!
رانی کو رات کی ان بے چین گھڑیوں میں گزرا ہر ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا علی
نے اُس سے اپنی اصلیت کس خوبی سے چھپا کر ایک عام انسان کا رول ادا کیا تھا۔
اور اس کے گھرانے میں رفتہ رفتہ اس حد تک رسائی حاصل کر لی تھی کہ گھر کا ہی ایک
فرد شمار ہونے لگے تھے۔ وہ لقاں بی، ماسی مریاں اور شرمین سے اُن کی دوستی! بے
تکلفی اور اپنائیت!! اور پھر خود رانی سے جو ایک تعلقِ خاطر تھا، وہ علاحدہ ہی احساس کا
حامل تعلق تھا۔

"اُف خدایا!"
وہ اپنا داہنا ہاتھ پیشانی پر رکھ کر بڑبڑائی
"کتنا بیوقوف بنایا اس شخص نے مجھے...... میں کیا سمجھتی رہی اور وہ کیا نکلا؟ میں
اس کی نظر میں اس قدر کم مایہ اور ارزاں تھی کہ مجھ سے مسلسل جھوٹ بولا گیا...... مسلسل
مجھ سے جھوٹ موٹ کا ڈرامہ کر کے لطف اُٹھایا گیا...... مزہ لیا گیا۔
آہ! مجھے ظالم نے تماشہ بنانا چاہا۔ اور...... وہ شاہجہاں اور افروز جہاں......!!"
رانی کی رُوح تک جھلس گئی۔

بڑے لوگوں کے خلاف اُس کا دل شکوؤں اور شکایات سے لبریز ہو گیا۔

جھلاہٹ ہی جھلاہٹ میں اگلی صبح اُس نے چار دن کی چھٹی کی درخواست کا[لج]
لکھ بھیجی۔ ویسے طبیعت بھی بہت گری گری سی ہو رہی تھی۔

صدمے پہ صدمہ۔ شاک پہ شاک۔ آخر کو تھی تو ایک نرم و نازک سی لڑکی ہی۔
حالات کی ستم ظریفی کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔ ایک ناگوار سے سکوت نے اُس کی
پوری ذات کا احاطہ سا کر رکھا تھا ان دنوں وقت ملا تو اُس نے بڑی سچائی سے اپنے
آپ کو ٹٹولا۔ ایک باشعور، سمجھدار اور سلجھی ہوئی لڑکی کی طرح اپنا تجزیہ خود کیا۔
سوچوں، اپنے خیالات، تصورات اور زاویہ نظر پرکھنے میں اُس نے کئی دن اور راتوں
عرصہ صرف کیا۔

وہ کیا چاہتی ہے؟

کیا در حقیقت اندر ہی اندر کسی دلی تعلق نے اُسے نیم جان کر رکھا ہے؟

اُس نے لٹو کا لایا ہوا پروپوزل رد کیوں کیا؟ جو کچھ اُنھیں جواب دیا تھا، اگر
وہی ہے تو ..... اب تردد کس بات کا تھا؟

آخر وہ کیا چاہتی ہے؟

علی کی حقیقت کے راز پر سے پردہ سرک جانے سے وہ ملول کیوں ہو گئی؟

اور وہ بھی اس حد تک کہ صدمہ بن کر نروس سسٹم مجروح کر گیا؟

علی ایک شخصیت کے بجائے صاحبزادہ دیدار علی خاں ثابت ہو گئے تو کیا ہوا؟

اگر وہ اسی طرح بیمار پڑتی رہی تو اماں اور شرمین کا کیا بنے گا؟

رانی کو اپنے کمزور اعصاب پر سے بے حد شرم اور ندامت محسوس ہوئی۔

بے شک! اُس کی شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ میں اُس کے والدین کی عاقبت
اندیشی اور آپس کے اختلافات کا زبردست دخل تھا، تاہم سوچنے کی بات یہ ہے کہ

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

دنیا میں کیا نہیں ہو جاتا! اچھے بُرے واقعات اور حادثات کسی کو بھی پیش آ سکتے ہیں تو
پھر کیا پچھاڑ کھا کر مر جانا چاہئے!!

اپنی ذات کا مشاہدہ اور تجزیہ اُس کی آنکھیں کھول گیا۔

چار دن کی مختصر رخصت میں اُس نے کئی بڑے فیصلے کر ڈالے۔ بڑی
سنجیدگی اور سچائی کے ساتھ اُس نے اپنی زندگی گزارنے کے چند اُصول وضع
کئے اور دل میں تہیہ کر لیا کہ اب بہر صورت انہی اُصولوں پر عمل پیرا رہنا
ہے۔

علی نے صاحبزادہ دیدار علی خاں ہوتے ہوئے بھی اُس کے گھر کے اندرونی
ماحول تک جس طرح کی رسائی حاصل کر رکھی تھی اُس نے جی ہی جی میں طے کر لیا کہ
اُس کو یہ زیادتی بھی بہر صورت برداشت کرنی ہو گی۔ اور اب یہ دیکھنا تھا کہ اس
انکشاف کے بعد خود اُن کا رویہ کیسا رہتا ہے؟

دل و دماغ قدرے پُرسکون ہو گئے۔

چار دن کے بعد وہ پابندی سے کالج جانے لگی اور اپنے روزمرہ کے معمولات
میں پوری طرح ضم ہوتی چلی گئی۔

"قصرِ دیدار" سے اُس نے اپنے طور سے جیسے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اُس طرف سے
بھی حیرت انگیز طور سے کسی ردعمل کا اظہار نہ ہوا۔

اُسے زیب النساء بیگم اس حد تک بے نیاز سی لگتی تھیں گویا تمام تر معاملات سے لا
علم اور بے خبر ہوں!

حالانکہ رانی کے دل کو پکا یقین تھا کہ وہ علی کی سازش سے آگاہ ہیں۔

چند دن بخیریت گزر گئے۔

مگر جلد ہی خود ساختہ خاموشیوں کا سکوت ٹوٹنے لگا۔

اب ''قصرِ دیدار'' سے بار بار اُس کے نام پیام آنے لگے۔ کسی روز بُلاوے پہ بلاوا آ جاتا۔

کبھی صاحبزادی افروز جہاں بُلا رہی ہے تو کبھی شاہ جہاں کا نامہ آ پہنچا کالج میں ان کی ملازمہ خاص بار بار آتی۔ رانی پیغامات سُن سُن کر تنگ آ جاتی مگر وہ بھی اپنے مزاج کی ایک تھی۔ ٹس سے مس نہ ہوتی۔

گھر میں یہ حال تھا کہ علی وقت بے وقت چلے آتے۔

مگر اب رانی نے اُن پر توجہ ویسی چھوڑ دی تھی۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُن کی صورت دیکھتے ہی اسے غصہ آ جاتا۔

اُنھوں نے بہانے بہانے بہت مرتبہ پہلے کی سی دوستی اور بے تکلفی کی فضا قائم رکھی چاہی' گویا کوئی نئی بات ہی وقوع پذیر نہیں ہوئی ہے' مگر رانی ہر بار نہایت صفائی سے کنی کترا کر ان کی کوشش ناکام بنا دیتی۔

شرمین کے ساتھ مل کر وہ خوب بچوں کی طرح اودھم مچاتے' ماسی مریاں کو چھیڑ چھیڑ کر چٹکلی باتیں کرتے' امّاں کے پاندان سے ضیافت اُڑاتے' حسبِ دستور ہنستے ہنساتے۔ لطیفہ گوئی کرتے۔ پہلے حالانکہ ایسا اتفاق کم کم ہوا کرتا تھا کہ وہ اُس کی موجودگی میں ضرور ہی آئیں مگر اب اپنی اصلیت کھل جانے کے بعد وہ خاص طور پر کالج ٹائم کے بعد بھی آنے لگے تھے' لیکن رانی قطعی قابلِ توجہ نہ جانتی۔ بلکہ اُس نے جب یہ محسوس کیا کہ وہ صرف علی ہی بنے رہنا چاہ رہے ہیں' تو اُس نے بھی امّاں کو حقیقت بتانے سے گریز کیا اور چُپ سادھ لی۔

وہ کیوں بے کار میں نیا گل کھلا کر اُن بے چاری کو پریشان اور ہراساں کرتی!

ہاں۔ البتہ اپنے طور پر یہ احتیاط برتنے لگی تھی کہ ادھر علی کی گاڑی گیٹ سے دکھائی دی اور وہ پچھلے گیٹ سے پڑوس میں چلی جاتی۔

اُس کی یہ بے کلی اور تغافل علی سے چھپ نہ سکی۔

رات کو اماں جان اور شرمین سو جاتیں تو اکثر فون کی گھنٹی بجنے لگتی...... وہ ریسور اُٹھا کر مستقل کریڈل سے نیچے رکھ دیتی۔

شہر میں تو کیا! پوری دنیا میں ان تنہا رہ جانے والی ماں بیٹیوں کو کون جانتا تھا' یا ایسا بے تکلف اور نزدیک تھا جو آدھی رات کے سناٹے میں بات کرنے کا متمنی ہوتا!

رانی نے اپنے گوشت پوست کے دل کو پتھر کر لیا تھا۔

اپنے تئیں سخت سے سخت ترین بن گئی تھی۔

وہ اتنی سی عمر میں وہ بڑے لوگوں کے بڑے ہتھکنڈوں سے خوب واقف ہو گئی تھی۔ پوری طرح آگاہ تھی۔

اور ان ہتھکنڈوں سے چھوٹے لوگوں کے دلوں میں پڑ جانے والے بڑے بڑے سوراخوں' زوح میں چٹخی درازوں اور پھر ان سے ساری زندگی کے رستے بہتے اور سسکتے زخموں سے واقف ہو گئی تھی' جو انسانوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے ہیں۔

اتنی ہی عمر میں اُس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھ لیا تھا۔ اب کسی سے دھوکا کھانے کا حوصلہ باقی نہ رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے ابو اور اماں جان کی بے جوڑ شادی اور پھر اُس کی ناکامی کا نچوڑ بن کر رہ گئی تھی۔ جو کچھ اُس نے دیکھا' پرکھا اور سمجھا تھا' اُس کا ثمر اس درجہ تلخ اور کڑوا تھا کہ وہ نیچے سے اوپر تک تلخیوں اور کڑواہٹ کا ڈھیر بن کر رہ

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

گئی تھی۔

زندگی کے چہرے کا خوبصورت اور دلکش رخ اُس نے دیکھا تھا' نہ اُس کی لطافت اور رنگینی سے لطف اندوز ہونے کی حس اُس کے وجود میں بیدار ہوئی تھی۔



For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

موسم بہار اپنا اپنا جلوہ دکھا کر روپوش ہو چکا تھا اور اب ماحول خزاؤں کی لپیٹ میں تھا۔

تمام تمام دن شدید گرمی رہتی۔

گھٹن اور حبس سے دم گھٹتا رہتا۔ سارا دن پسینہ دھاروں دھار بہتا۔ بھری دوپہر میں ہواؤں کے کوئی جھونکے چلتے بھی تو وہ بھرپور گرم لُو کے تھپیڑے ہوتے۔ جن سے جسم و جاں مزید جھلس اُٹھتے۔

کسی کسی دن تیز آندھی چلنے لگتی۔ مٹی اور گرد و غبار کے بگولے اُٹھتے اور فضائیں مزید اُداسیوں اور ویرانیوں کی نذر ہو جاتیں۔ طویل دن اور سنسان دوپہریں کاٹے نہ کٹتیں۔ امتحانات سے فارغ ہو کر شرمین تو آرام سے گھر بیٹھی تھی مگر رانی ابھی تک مصروف تھی۔

مئی کا چلچلاتی دھوپ سے لبریز اور گرم لُو کے تھپیڑوں سے بھرپور مہینہ سر پر سایہ فگن تھا اور ابھی کالج بند ہونے میں کافی دن تھے۔ جب تک گرمی کی

تعطیلات کا آغاز ہوتا' اس وقت تک تو شاید بازاروں میں لان کا ایک پیس بھی باقی نہ رہتا۔ اماں جان نے کتنے ہی دنوں سے موسم کے لحاظ سے کچھ سامان کی فہرست دے رکھی تھی مگر کالج سے آنے کے بعد رانی پر تھکاوٹ اور سستی کا اس قدر غلبہ ہوتا کہ شام گئے تک آنکھیں کھولنے کو جی نہ چاہتا۔ اوپر سے گرمی کی شدت!

بہت سارے دنوں کی ٹال مٹول کے بعد ایک روز اماں سے زبردست پھٹکار پڑ گئی اور اُس کی تمام سستی ہوا ہو گئی۔

اگلی شام رانی اور شرمین شاپنگ کی غرض سے بازار آئیں تو پہلی ہی دکان پر علی سے ٹکراؤ ہو گیا۔

وہ معلوم نہیں سلیز مین سے کیا کہہ رہے تھے' ان دونوں کو خود سے قریب پا کر حیرت اور خوشی سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے۔

رانی کا سارا موڈ غارت ہو گیا۔

جانتی تھی اب اِن سے جان چھوٹنی ممکن نہیں۔ تاہم وہ لاتعلق سی ہو گئی۔ پوری توجہ اور دھیان سے اماں کی مطلوبہ اشیاء کی فہرست چیک کر کر کے خریداری کرتی رہی۔ اپنے اور شرمین کے علاوہ ماسی مریاں کیلئے لان کے کئی گئی سوٹ خریدے۔

علی حسب توقع ساتھ ہو لیئے تھے۔ اُن کی بہترین دوست شرمین جو ہمراہ تھی اس لئے رانی اُن سے ہمکلام ہوتی نہ ہوتی' انہیں کیا فرق پڑتا تھا۔ ہر طرح کا تبصرہ نہایت روانی سے سناتے رہے تھے اور بظاہر اُن کی مخاطب شرمین تھی۔

رانی دل ہی دل میں جل بھن کر خاک ہوئی جا رہی تھی۔

ایک گفٹ سینٹر پر شوکیس میں رکھے ہوئے سفید دودھیا جگمگاتے تاج محل کے

ماڈل کو دیکھ کر شرمین سے کہنے لگے

"دیکھو بے بی! کس قدر خوبصورت اور دلکش مسجد ہے۔ پتہ ہے یہ روٹھے ہوئے دوست کو منانے کے کام بھی آتی ہے۔ ایسے لوگ جو اندر سے تو دراصل اپنے ہوتے ہیں مگر اوپر اوپر سے خفا رہتے ہیں۔ میرا بھی ایک دوست ہے۔ بہت پیارا پیارا سا۔ بس یونہی ذرا آج کل روٹھا ہوا ہے مجھ سے۔ کیا خیال ہے خرید لوں اُس کیلئے؟ اتنی حسین اور یادگار مسجد دیکھ کر شاید اُس کا غصہ کم ہو جائے اور وہ مجھے معاف کر دے۔"

شرمین نے اُن کی لمبی چوڑی تمہید پر توجہ نہ دی اور ہنس کر بولی۔

"ہائے علی بھائی! آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم! یہ مسجد کب ہے؟ یہ تو تاج محل ہے...... تاج محل!"

"اوہ...... ویری سوری"

وہ آنکھوں سے رانی کو مسکرا مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولے۔

"بس تو پھر ہم یہ اماں بی کے لیئے خرید لیتے ہیں۔ اُس روٹھے ہوئے دوست کو کسی دوسری ترکیب سے منائیں گے۔"

رانی کی قوت برداشت اب جاتی رہی۔ اُس نے سارے شوپنگ بیگز اکٹھے کر کے اکیلے ہی سنبھالے اور سینٹر سے نکل کر تیز تیز چل دی۔

اُسے شرمین کی نااتفاقی پر سخت غصہ آ رہا تھا جو لاکھ آنکھیں دکھانے کے باوجود علی کے ساتھ چپکی ہوئی گھوم رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں وہ دونوں بھی لدے پھندے پیچھے پیچھے آ گئے۔

رانی اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے سخت بیزاری سے لب بھینچے بیٹھی تھی۔ اُسے شدت سے شرمین کا انتظار تھا۔ علی کو دیکھ دیکھ کر کوفت ہو رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا ایک سیکنڈ کے

بھی ہزاروں حصے میں یہاں سے نکل بھاگے۔

شرمین علی کے ساتھ ساتھ سڑک کراس کر کے آئی تو اُس نے علی کو نظر انداز
کے بہن کو مخاطب کیا اور فرنٹ ڈور کھول کر بولی۔

"چلو بیٹھو جلدی سے۔ آج سوسو کے چل رہی ہو کیا؟"

شرمین ہنس پڑی۔ اُس نے چاہا کہ رانی کے برابر بیٹھ جائے علی نے لپک کر
اُس کا ہاتھ تھام لیا اور جلدی سے بولے۔

"چلو بے بی آئس کریم کھلا لائیں دیکھو کس غضب کی گرمی ہے۔"

پھر ذرا سا تھم کر رانی پر اک شرارت آمیز نگاہ ڈال کر اضافہ کیا۔

"اُفوہ...... چہرہ تو تمہارا لال بھبوکا ہو رہا ہے۔ چلو چلو۔ جلدی سے چلو۔ ٹھنڈی
ٹھنڈی آئس کریم موڈ بحال کر دے گی۔"

رانی خوب جان رہی تھی وہ اُسے غصہ دلا رہے ہیں۔ حقیقت میں اُسے تاؤ بھی
بہت آ رہا تھا۔

مگر براہِ راست اُن کے منہ لگنا نہ چاہ رہی تھی۔ ضبط اور تحمل کا دامن تھامے
تھامے شرمین کو ڈانٹنے لگی۔

"تم...... بہت بیوقوف ہو شرمین! آج تو بے ہودگیوں کی حد ختم کر دی ہے
نے۔ آؤ بیٹھو جلدی سے ...... بہت آئس کریم بے آ گئے۔"

"ارے...... کس چکر کے کہنے میں آ رہی ہو بے بی۔"

علی فوراً درمیان میں آ گئے۔

"ان کے غصے سے تمہاری آئس کریم کو بخار آ جائے گا!"

اتنا کہتے کہتے شرمین کو بڑے دُلار سے اپنی گاڑی کی طرف کھینچ لے گئے۔

رنج اور طیش کی زیادتی سے رانی کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ اُس نے گاڑی

...رٹ کی اور آندھی طوفان کی طرح گھر پہنچ کر دم لیا۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ اماں جان
...دیبوں کے ہاں گئی تھیں اور ماسی مریاں پر نیند طاری تھی۔ ورنہ بغیر شرمین کے اُسے
...کر دیسوں سوال کر ڈالتیں۔

اپنے کمرے میں گھس کر اُس نے تمام سامان پٹخا اور بیڈ پر لیٹ کر ان اتفاقات
...نے لگی جو بیک وقت تمام حاصل کردہ سکون تلپٹ کر گئے تھے۔ علی کی مسلسل ڈھٹائی پر
...ت زدہ بھی تھی۔

"خبر نہیں کیا چاہتے تھے وہ!

کیا اب تک اُنہیں اپنے طویل ڈرامے سے اُکتاہٹ نہیں ہوئی تھی؟

مزید اور کتنا تماشہ بنانا چاہتے تھے اُس کی ذات کو! بہت ہی ارزاں اور کم مایہ سمجھا
...وں نے مجھے! کاش! اماں جان نے انہیں اپنی سادگی ہی سادگی میں ہمارے گھر
کے اندرونی بھید نہ دیے ہوتے!

چونکہ ہمارے باپ نے ہمیں دھتکار دیا اور بھائی کوئی ہے نہیں اس لئے وہ ہمیں بھی
...نے والا کھلونا سمجھتے ہیں!!"

لامتناہی سوچوں میں مستغرق اُسے احساس بھی نہ ہو سکا کہ کب کسی نے اندر
...ل ہو کر ایک جگ پانی اُس پر انڈیل دیا۔

ساتھ ہی علی کی گھمبیر آواز اُبھری۔

"زبیر علی بزنس مین یاد آ رہے ہیں کیا؟"

ایک تو اُن کی اچانک حرکت اوپر سے زبیر علی کا ذکر......
چڑھی ہوئی وہ پہلے سے تھی اس لیے ایکدم بھڑک اٹھی۔

اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے بدتمیزی سے بولی۔

"آپ کو شرم آنی چاہیے ایسی بات کہتے ہوئے۔ اور یہ کیا بے ہودگی ہے؟

شریف انسانوں کے یہی انداز ہوتے ہیں؟"

اُس نے اپنے گیلے بالوں اور بھیگے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن علی پر اُس کے بگڑنے کا ذرہ برابر اثر نہ ہوا۔ مسکرا کر بولے۔

"میرا کونسا اُن زبیر علی بزنس مین سے نکاح ہونے والا ہے جو میں شہ باقی رہی بات بے ہودگی کی۔ تو جناب! یہ حرکت بے ہودہ نہیں بلکہ عین ہے۔"

"بہت خوب۔" رانی نے زہر خند ہو کر پوچھا۔

"اس عقل مندی میں کونسی راز کی بات پوشیدہ ہے؟"

اُنھوں نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے سوچا..... انگارے بہت دہک رہے ہیں بُجھا ڈالوں گا۔"

وہ صاف اُس کے غصے اور گرمی سے تمتاتے رخساروں پر چوٹ کر گئے۔

رانی بالوں سے ٹپکتا پانی جھٹک کر چیخی۔

"ہر بات سے انجوائے کرنا تو خوب آتا ہے آپ کو۔ بہرو پئے کہیں کے"

اتنا کہہ کر باہر کی طرف لپکی۔

دفعتاً علی جھپٹے۔ اور دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اُسے دوبارہ بیٹھنے پر مجبور

اُن کی جسارت پر گنگ رہ گئی۔

علی کے چہرے پر ایک غایت درجے کی سنجیدگی چھا گئی تھی۔ پل بھر

موڈ بدل گیا۔ آنکھوں میں سچائی کا پرتو تھا۔

چہرے کے ایک ناقابل بیان تاثر کے ساتھ اُنھوں نے اُس کے آ

ہاتھوں جوڑ دیے اور عاجزی سے گویا ہوئے۔

"رانی! خدا کیلئے مجھے اب تو معاف کر دو..... میں بہت نادم ہوں۔ اپنے گذشتہ
ے اور طرز عمل پر۔ خدا گواہ ہے جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا اور تم نے
ِ النساء کالج کا ذکر کیا تو تمہاری قربت اور ملاقات پر بہت خوشی ہوئی تھی اور جی
وچ لیا تھا کہ بہت جلد تمہیں سچ بات سے آگاہ کر دوں گا مگر جب میں نے اُن
ِ چلبلیوں (افروز جہاں اور شاہ جہاں) سے تذکرہ تو وہ دونوں اڑ گئیں اور محض
ِ ستانے کیلئے اتنی لمبی پلاننگ کر بیٹھیں۔ پھوپھو جانی (زیب النساء بیگم) کو بھی
ں نے منا لیا تو..... تو۔"

"..... تو آپ نے بھی انجوائے منٹ کی ٹھان لی ہے..... یہی نا!"

رانی نے طنز بھرے انداز میں ٹوک دیا۔ اور اُن سے دور ہو کر بولی۔

"آپ بیکار اتنی لمبی۔ تفصیل بیان کر کے اپنا بھی اور میرا بھی وقت ضائع
ہے ہیں۔ میں نے کوئی شکوہ کیا؟ شکایت کی؟ خوب جانتی ہوں کہ بڑے
یونہی چھوٹے لوگوں سے انجوائے کر لیا کرتے ہیں وقت گزاری اور کچھ
ِ کے شغل کے طور پر کبھی کبھی بہروپ بھی بھر لیا کرتے ہیں۔ براہ کرم میرا
چھوڑ دیجیے۔"

"رانی!"

وہ بُری طرح تڑپ گئے۔

"للہ!" "ایسے طنز مت کرو۔ اتنے پُر تکلف لہجے میں۔"

اُن کی بات درمیان میں رہ گئی شرمین زور زور سے پکارتی چلی آ رہی تھی اسی

علی گھبرا سے گئے جلدی سے ڈریسنگ ٹیبل کی جانب بڑھ گئے اور برش بالوں میں کرنے لگے۔

"تم کب آئے علی میاں؟"

لتاں جان نے اندر داخل ہو کر دریافت کیا۔

علی سے پہلے شرمین ٹپک پڑی۔

"دیکھیے لتاں بھائی آپ کے لیے کیا لائے ہیں؟"

علی پر اب تک رانی کی تلخ و ترش باتوں کا اثر تھا۔ اُنھوں نے بمشکل خود کو سنبھالا اور ایک بناوٹی مسکراہٹ سے بولے۔

"آداب لتاں۔ یہ دیکھیے۔ یہ رہی آپ کی مسجد!"

اُنھوں نے ایک بھاری سا ڈبہ کھول کر اُن کے سامنے رکھ دیا۔

شفاف کانچ کے اندر بڑی فنکاری اور مہارت کے ساتھ جڑا ہوا جگمگ کرتا تاج محل دیکھ کر اماں کو اپنا آگرہ یاد آ گیا۔

اُنھوں نے آنچل سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

"ارے میاں! مسجد کاہے کو تاج محل کہو۔ اللہ اللہ! کیا شہر تھا۔ اپنا آگرہ خدا کی شان! کیسے کیسے عظیم اور زندہ جاوید انسانوں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ وا چیز انمول لائے ہو بیٹے!" علی کی ساری افسردگی کافور ہو گئی۔

اُن کے سامنے دوزانو ہو کر پوچھنے لگے۔

"آپ کو...... ممتاز علی کی یاد آ رہی ہے لتاں؟" وہ آہ بھر کر بولیں۔

"ہو بیٹا! اِن آنکھوں نے محبت کی یہ یادگار قریب سے دیکھ رکھی ہے۔"

علی نے انکھیوں سے رانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی ایک ایسی یادگار بنواؤں گا لتاں' زندہ جاوید لوگوں کیلئے۔"

رانی نے ایک قہر آلود نگاہ اُن پر ڈالی اور کڑھتی ہوئی اُٹھ کر باہر چلی گئی۔



رانی کچن میں جاتے جاتے رُک گئی۔
اندر سے علی اور ماسی مریاں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔
معلوم نہیں وہ کب آئے تھے اور کچن میں کیا کر رہے تھے۔
وہ کان دے کر سننے لگی۔ وہ پوچھ رہے تھے۔
"ارے آپ کو چین نہیں ہے۔ کیا کرنے لگیں اس برستی بارش میں؟"
جواب میں ماسی مریاں کی اُداس سی آواز سنائی دی۔
"ارے میاں اب کیا کرنے کو باقی رہ گیا ہیں! آج ساون بھادوں کی ۲۲ تاریخ ہے نا ہمارے بابا (والد) کی برسی کا دن۔ ہم باجرے کی روٹیاں پکا رہے انہیں بہت پسند تھیں۔ اسی پر فاتحہ دلائیں گے۔"
"او..... آئی سی....." علی کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔
چند لمحوں بعد بڑے سکون سے صاف لہجے میں گویا ہوئے۔
"دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ..... میرے اپنے نانا جان کی فاتحہ آج۔"

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

روٹی سینکتی ہوئی ماسی مریاں بڑے زور سے چونکیں۔
چمٹے سے پکڑی ہوئی روٹی تفن میں رکھ دی اور علی کو بغور دیکھنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی آنکھوں کے کنارے نم ہو گئے۔ لبوں پر ایک گھائل سی پُرسوز مسکراہٹ لرزنے لگی۔
علی بھی پوری طرح انہی کی طرف متوجہ تھے۔
دھیرے دھیرے وہ اُن کی طرف بڑھیں پھر بے تحاشہ روتی ہوئی اُن سے چمٹ گئیں وہ بھی شرمسار اولاد کی طرح اُن کے بوڑھے شانے تھپکنے لگے۔ اس وقت بہت متاثر لگ رہے تھے۔ جذبات کی شدت سے چہرہ تمتما رہا تھا۔
باہر کھڑی رانی کو شاک پہ شاک لگ رہے تھے۔ ضبط نہ ہو سکا تو گردن بڑھا کر اندر جھانکنے لگی تھی۔
ماسی کی جھریوں زدہ رخساروں پر آنسو اک تواتر سے گر رہے تھے۔ علی نے جیب سے رومال نکالا۔ نہایت پیار اور ملائمت سے اُن کے اشک پونچھنے لگے۔
ماسی مریاں کی بھیگی بھیگی بھرائی ہوئی آواز کپکپائی۔
"بیٹا! میں تم پر پہلی نگاہ ڈالتے ہی چونک گئی تھی..... تم ہُو بہو نبی بھائی اپنے باپ کی تصویر ہو..... جب وہ مجھے ملے..... بالکل یہی عمر تھی اُن کی۔ ایک نقش بھی نہیں چھوڑا تم نے اُن کا۔ میرے دل و نظر نے بہت کچھ کہا تھا اندر سے مگر مجھے کوئی تصدیق نہ تھی۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ ایک شاد بیگم ضرور اُن کی نشانی ہے۔ سوائے اپنے قریب بٹھا کر دیکھ لو۔ خود بھی دنگ رہ جاؤ گے۔ اپنی اور اُس کی مشابہت سے اب چونکنے کی باری علی کی تھی۔ جلدی سے کہنے لگے۔
"جی ہاں ہاں..... آپ نے تذکرہ کیا تھا۔ خوب یاد آیا۔ گویا ایک دو نہیں بلکہ تین عدد بہنوں کے بھائی ہیں ہم۔"

ماسی مریاں نہال ہو گئیں۔

مگر اپنی بات کا سرا دوبارہ جوڑتے ہوئے بولیں۔

"تمہیں یہاں بیگم صاحبہ کے ہاں دیکھ دیکھ میں حیران ہوتی کہ آخر مجھے اس اپنے اپنے سے کیوں لگتے ہو! تمہاری بہت سے عادات اور رنگ ڈھنگ سے واہ ہو کر مجھے یقین کامل ہونے لگا تھا کہ میرا تمہارا کوئی نہ کوئی ناطہ ہے ضرور.... مگر حقیقت ہونے کے باوجود یہ بات کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ میرا! کون کرتا؟ اور تم سے کیا کہتی؟ یہ خدشہ دامن گیر رہتا کہ خدا معلوم تم پر کیا اثر ہو مگر تمہارا ایمان جاتے!

ماسی مریاں بہت آہستہ سُروں میں بول رہی تھیں۔

علی نے ان کو بڑی سہولت سے ایک اسٹول پر بٹھا دیا تھا اور خود ان کے نزدیک کھڑے ٹکر ٹکر ان کی صورت تک رہے تھے۔

آج تو ماسی مریاں کا خاموش ہونے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ ذرا تھم کر انھوں نے سانس بحال کیا پھر دوبارہ گویا ہو گئیں۔

"بیٹا! ایک روز جب میں تمہیں اور رانی بٹیا کو اپنی پوری زندگی کی روئداد سنا رہی تھی تو ایسا میں نے خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔

بے سبب اپنے ڈھکے چھپے اور بھولے بسرے ماضی پر سے نقاب نہیں سرکائے تھے..... ورنہ بیٹا! میں نے تو کبھی اصل واقعات اپنی ان بیگم صاحبہ یعنی (اماں جی) کو بھی نہیں سنائے ہیں۔ تمہارے سامنے میں یہ اقدام تمہارا ردِ عمل جاننے کیلئے کیا تھا اسی روز سے تمہاری طرف سے کسی پیشرفت کی منتظر تھی۔ لیکن تمہاری طرف جامد خاموشی طاری تھی۔ اب تو بالآخر تھک ہار کر میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ سب میری عقل کا پھیر ہے۔"

"جی ہاں۔ آپ کا کہنا بالکل بجا ہے۔"

علی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"بسا اوقات پے در پے کے ناکام واقعات انسان پر مایوسی طاری کر دیتے ہیں رسید ہی سادہ سی سچائی بھی مسخ ہو جایا کرتی ہے۔

آپ کی کہانی آپ کی زبانی سن کر واقعی میری خاموشی طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئی۔ لیکن..... در پردہ ایک خاص مصلحت تھی۔"

وہ تھوڑی دیر کے لیئے خاموش رہ کر دوبارہ گویا ہوئے۔

"آپ کی داستانِ حیات کے (End) اختتام نے مجھے بُری طرح چونکا دیا تھا۔ پھر اُس وقت تو کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہ رہی تھی جب رانی کے اٹھ کر چلے جانے کے بعد میں نے نام پوچھا اور آپ نے کہا تھا۔

"نواب ذوالفقار علی خاں۔"

کیونکہ حسنِ اتفاق سے میری یہی ولدیت تو تھی مگر حیرت انگیز طور سے ذہن کے نہاں خانوں میں کوئی مٹا مٹا سا خاکہ اُبھرنے لگا تھا۔ کیا؟ یہ پوری طرح سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مگر میں شدید قسم کی اُلجھن اور کشمکش میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اُسی دن سے ایک کرید لگ گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بہت بچپن میں کوئی بات سُنی تو تھی مگر تصدیق نہ تھی۔

بہت غور و فکر کے بعد اچانک ہی ایک دن مجھے اپنے پھوپھا صاحب یاد آ گئے۔ میں نے اپنی زندگی کے طویل ماہ و سال لندن میں انھی کے زیرِ سایہ گزارے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ میرے انتہائی شفیق بزرگ ہیں بلکہ مہربان اور بے تکلف ساتھی بھی ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ وہاں کسی موقع پر انھوں نے والد صاحب کی شادی کے متعلق کچھ کہا بھی تھا۔

پوچھتے کو تو میں شائد پھپھو جانی سے بھی پوچھ لیتا لیکن مجھے مکمل حالات کی تصدیق
اور سند درکار تھی۔

آپ کو یاد ہوگا کچھ عرصہ قبل میں ایک ڈیڑھ ہفتہ متواتر غیر حاضر رہا تھا! وہ اسی
سلسلے کی کڑی ہے کہ میں از خود پھوپھا صاحب سے ملنے چلا گیا تھا۔"

ماسی مریاں جو بغور ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ بے چین ہو کر بولیں۔ "پھر...
پھر کیا ہوا......؟"

"کیا ہونا تھا؟"

وہ معصومیت سے مسکرائے۔

"آپ ہی تو ہماری اماں جانی ہیں......"

ماسی مریاں کو حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساسات نے جکڑ لیا۔ وہ ساکت ہو
گئیں۔

علی اپنے سفر کی وضاحت کرنے لگے۔

"میں نے تمام واقعے کی مفصل تحقیقات طلب کیں پھوپھا صاحب سے۔ او
خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ انھوں نے تمام باتوں کی تصدیق کر دی اور مزید بتایا ک
"نواب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے ایک بہت بزرگ ملازم (جو اب انتقال
کر چکے ہیں) انھوں نے اس سربستہ راز پر سے پردہ اٹھایا تھا۔ ویسے مرحوم کا مقص
کسی برائی یا غلط نظریے سے نہیں بلکہ یہ نیک خیال تھا کہ نواب صاحب کی اچانک
وفات سے آپ بچی کے ہمراہ تنہا اور بے سہارا رہ گئی ہیں۔ اس لئے آپ کی مناسب
کفالت کی جائے مگر وقت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ حقیقتاً آپ تک کسی دوسرے
معنوں میں پہنچی اور آپ رات کے اندھیرے میں وہاں سے رخصت ہو گئیں تو باوجو
تلاش بسیار کے آپ کا کچھ سراغ نہ مل پایا۔

ہمارے ہاں کے وہ پرانے بزرگ ملازم جنہوں نے آپ کے متعلق پھوپھا
صاحب کو اطلاع پہنچائی تھی دراصل وہ صاحب تھے، جن کے ذریعے نواب صاحب
آپ کو ماہانہ اخراجات وغیرہ پہنچایا کرتے تھے۔ ان کے سوا دوسرا کوئی اس معاملے کا
راز دان نہ تھا، نہ گواہ۔ ان کی زبانی پھوپھا صاحب کو صرف اتنی تفصیل معلوم ہو سکی تھی
کہ نواب صاحب کسی موقع پر اپنے کسی دیرینہ دوست کے انتقال پر تعزیت کے لیے
راول پور سائڈ پر گئے تھے۔ اتفاق سے میت دفنائی جا چکی تھی۔ چنانچہ وہ فاتحہ کے لیے
قبرستان تشریف لے گئے۔ بعد کے واقعات کی تفصیل ہمیشہ پردے میں رہتی۔ اگر
آپ از خود نہ بتاتیں۔ اور یہ بھی اتفاقات ہیں زمانے کے۔

چنانچہ اب تو سیدھی سی حقیقت یہ ہے کہ آپ ہماری اماں جانی ہیں۔" اتنا کہتے
کہتے وہ ماسی مریاں کے سامنے جھک گئے۔

ماسی نے محبت و شفقت کے بے پناہ جذبوں سے مغلوب ہو کر انہیں کلیجے سے
لگا لیا۔

یوں گویا برسوں کے بچھڑے ماں بیٹے کا ملن ہوا۔

ماسی کی آنکھیں بادلوں کے ساتھ ساتھ ساون بھادوں برسا رہی تھیں۔ خود علی
بھی آبدیدہ تھے۔ دفعتاً چونک کر بولے۔

"بس بہت دن رہ لیں آپ ادھر ادھر۔ میں جلد ہی پھپھو جانی سے بات کروں
گا۔ پھر یقیناً آپ کو ہمارے ساتھ رہنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے پھپھو جانی خود آپ کو لے
کر جائیں گی۔"

"نہیں بیٹا!"

ماسی مریاں نے تڑپ کر ان کی بات کاٹ دی۔

"اب زندگی کے اس موڑ پر پہنچ کر جبکہ زیادہ وقت گزر چکا اور کم رہ گیا۔ معلوم

نہیں کب زندگی کی شام ہو جائے۔ تم ان دبی ہوئی چنگاریوں کو دبا ہی رہنے دو۔ مجھے اپنی بیگم صاحب کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی۔ تم نے چاہت سے ماں پکار لیا، میرے لیے یہی بہت ہے۔ بس گھر میں کسی سے ذکر مت کرنا۔"

"جی۔ ہرگز نہیں۔"

وہ فیصلہ کن انداز میں گویا ہوئے۔

"ایسا قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ نے مجھے اتنا بے حمیت اور گرا ہوا سمجھا ہے؟ ابھی تو مجھے آپ سے اپنی بہن کا نام پتہ دریافت کرنا ہے۔ بتائیے وہ کہاں ہیں؟"

"اسے نہیں بیٹا" وہ فوراً خوش آمد پر اتر آئیں۔

"وعدہ کرو تم ایسا کچھ تردد نہیں کرو گے! معلوم ہے اس طرح لوگ خبر نہیں کیسی باتیں کریں! کوئی کچھ کہے گا، کوئی کچھ۔ مثل مشہور ہے: مارتے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے، کہتے کی زبان کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ اس لیے تحمل سے کام لو، تحمل سے۔"

علی نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"یہ ہمارے ذاتی معاملات ہیں۔ کسی کی کیا مجال دخل اندازی کرنے کی!"

"خیر..... ابھی فی الحال تو جانے دو۔"

ماسی مریاں نے انہیں پیار سے سمجھایا۔

ان دونوں کے انکشافات اور نئی نئی باتیں پتھر کی طرح بنی رانی کے سُن پڑے احساسات پر سنگ باری کر رہے تھے۔

آخر کب تک کھڑی رہتی۔ وہ تیر کی طرح چلی اور جیسے تیسے اپنے کمرے میں آکر دم لیا۔

اعصاب جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ ماسی

مریاں نے جو ایک روز آسے اور علی کو اپنی آپ بیتی سنائی تھی، وہ رانی کو بھی حرف بہ حرف یاد تھی۔ بقایا قصے سے اب آگاہی ہو گئی تھی۔ اس عجیب و غریب داستان پر اعتبار نہ آرہا تھا۔

اُس کی عقل حیران تھی کہ اتنے بڑے نواب کی بیوی ایک معمولی سے گورکن کی بیٹی ہو سکتی ہے!

اور ذرا علی کا حوصلہ دیکھو۔ کس دل گردے سے جدوجہد کر کے تمام قصے کی ازسر نو تحقیقات کیں۔ سچ جھوٹ کی جانچ کرنے کیلئے سب سے چھپ کر ایک طویل سفر کیا اور آج......

اُس ماسی مریاں کو کس عقیدت اور احترام کے ساتھ "ماں" کہہ کر گلے لگا لیا تھا۔

کیسی نہ حیرت ناک حقیقت!

رانی کے پورے جسم میں بار بار سنسنیاں سی دوڑنے لگتیں۔ اگر جو وہ خود اپنے کانوں سے ہر بات سن کر نہ آرہی ہوتی تو شاید کبھی اُسے یقین کرنا محال ہو جاتا۔ اتفاق سے جس دن ماسی مریاں نے گوار کی پھلیاں توڑتے توڑتے اپنی کہانی سنائی تھی، علی کے ساتھ وہ بھی موجود تھی۔ اور بڑی دلچسپی سے ان کی حکایت سنتی رہی تھی۔

اُس کے جی میں بار بار اُبال سے اُٹھ رہے تھے کہ دوڑ کر جائے اور لقماں جان کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر یہ انکشاف سنا ڈالے۔ ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا......

مگر...... علی کی وارننگ پیر کی بیڑی بن رہی تھی۔



بہت سارے بے کیف و بے رنگ دن بہت بے کیفی سے گزرتے چلے گئے۔ایک کے بعد ایک۔

وقت لمحہ لمحہ لحظہ لحظہ سرکتا ہوا کہیں سے کہیں جا پہنچا۔مگر رانی کی مسلسل ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس کا میل "قصر و دیار" والوں سے نہ ہو پایا۔صاحبزادی شاہجہاں اور صاحبزادی افروز جہاں اسے بلا بلا کر خاموش ہو گئیں اور رانی نے سکھ کا سانس لیا۔

گرمی کی تعطیلات میں کالج بند ہوئے اور کھل بھی گئے۔

ساون آئے۔اور آ کر چلے بھی گئے۔ایک رُت آئی پھر اگلی رُت میں بدل گئی۔رانی کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔

علی اب بھی آتے۔شرمین سے دل لگی کرتے رہتے۔اماں جان سے دلدہی کی باتیں کرتے۔بہت دنوں سے اب ان کی توجہ ماسی مریاں کی طرف زیادہ مبذول رہنے لگی تھی۔گھنٹوں ان سے باتیں کیا کرتے۔اگر وہ لان کے کسی درخت کے نیچے بیٹھی

ن میں نہ ملتیں تو ان کے کوارٹر میں جا نکلتے۔ماسی مریاں نے اپنی قسمیں دے دے انہیں اپنا راز افشاء کرنے سے روک رکھا تھا۔

اس انکشاف سے آگاہ ہونے کے بعد حیران و پریشان تو رانی بھی بہت دن رہی ں۔حتی کہ کئی رات اس کی نیند اڑی رہی۔بار بار جی چاہتا تھا کہ اس بارے میں کم سے کم اتاں جان کو تو ضرور بتا ڈالے۔

مگر بعد ازاں اس کی دور اندیشی ہی کام آ گئی۔کیونکہ اس دن کے بعد پھر دن پہ ن گزرتے گئے۔لیکن علی یا ماسی مریاں کی جانب سے بھی کوئی وضاحت یا انکشاف نے میں نہ آیا۔بعض دفعہ رانی دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی کہ اس نے اپنی زبان ہیں کھولی تھی۔ورنہ بہت سبکی ہوتی! بالآخر رفتہ رفتہ وہ یہ بات بھول سی گئی۔

گلابی جاڑوں کی رُت مہربان ہوئی تو ساتھ ہی رحمتوں اور برکتوں سے بھرپور ماہ مضان بھی شروع ہو گیا۔قدرتی بات ہے ہر مسلمان مرد اور زن بلکہ بچے تک حصول ب کی ریاضتوں میں مصروف ہو گئے۔ہر طرف ایک الوہی سی کیفیت کا اظہار ونے لگا۔

احترام رمضان میں کالج دن کے بارہ بجے آف ہو جاتا۔

رانی کالج سے واپس آتی تو تھوڑی دیر آرام کر کے ظہر کی نماز کیلئے شرمین کو بھی پنے ساتھ کھڑی کر لیتی۔فجر کے بعد جتنا قرآن پاک رہ گیا ہوتا دونوں بیٹھ کر تلاوت رتیں اور پھر کچن میں جا گھستیں۔

اماں جان اور ماسی مریاں تو روزے کی نقاہت میں بیٹھی بیٹھی باتوں کے سوا کسی ام کی نہ رہتیں۔یہی دونوں نت نئی چیزیں پکا پکا کر افطاری کی تیاری میں مصروف ہتیں۔

رات کو تراویح چاروں مل کر پڑھتیں۔

روزوں کی وجہ سے آج کل دن میں خوب فرصت ہی ہوتی۔ کبھی تو
مریاں اپنے عہد ماضی کی نقرئی چمکدار یوں کی سیر کرانے نکل کھڑی ہوتیں۔ بس اور
اماں جان رانی اور شرمین کے بچپنے کی کوئی کوئی ہنسی دل لگی کی یادوں میں کھو جاتیں
کسی کسی دن گاہے گاہے انھیں رابعہ بھیا کی یاد ستانے لگتی۔ آنکھ سے آنسو
کا تار بندھ جاتا۔ حالانکہ ماسی مریاں کو دیکھے بغیر ہی رابعہ بھیا کے نین نقش اور ادا
سب از بر ہو چکی تھیں، مگر وہ نہایت تحمل اور بردباری سے دوبارہ سب تفصیلات پ
توجہ سے سننے لگتیں۔ کبھی کبھار تو پوری دوپہر یہی تذکرہ ہوتا رہتا اور روزہ کٹ جاتا۔
پان نہ کھانے کی وجہ سے اماں جماہی پر جماہی لیتی رہتیں۔ آنکھوں سے
ڈھلکا بہتا رہتا اور اُن کا بیان جاری و ساری رہا کرتا۔

لیکن ایک بات ہے۔

مجال نہیں ہے کہ اگر کبھی بھولے سے بھی شوہر کا نام لے لیتیں!

بچیوں کے ملال کا خیال اُن کی زبان پر تالے ڈالے رکھتا۔

اتفاق سے چوتھے روزے پہلا جمعہ آ پہنچا۔

سفید بُراق کرتے شلوار کے سوٹ میں رانی جیسے براہ راست دل میں اُ
جا رہی تھی۔ نظر لگ جانے کی حد تک وہ پیاری لگ رہی تھی۔

سادگی کا بھی اپنا ہی ایک منفرد حُسن ہوتا ہے۔

لیکن وہ اپنی شخصیت کے جادوئی تاثر سے بے نیاز ہی رہتی تھی۔ اس وقت
جیسے ہی وہ انجن بند کر کے گاڑی سے اُتری لان کے آخری حصے میں ٹہلتے ہوئے
ٹھٹھک کر رہ گئے۔

اُن کی تشنہ نگاہیں اس کمسن دل لڑکی کے نکھرے نکھرے سراپے پر جم گئیں۔
میں دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ سرسراتے ہوئے سفید آنچلوں میں وہ اپنے

ے کے ساتھ اپنی عمر سے زیادہ زیادہ باوقار لگ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم
ی کالج کی طرف جانے والی روش کی طرف چلی جا رہی تھی۔ نہ کسی کی پرواہ...... نہ
ں سے متاثر......

"یا میرے خدا!"

علی نے سنگی بنچ پر بیٹھ کر بے اختیار سر تھام لیا۔

"اس پتھر میں جونک کس طرح لگے گی؟ صلح کرنے کا کون کون سا طریقہ نہیں
ڈالیا...... مگر قدرت کو بھی رحم نہیں آتا...... میں بھلا اس اپنے آپ سے بھی بے خبر
لی کو کیسے چھوڑ دوں؟ کیسے بھول جاؤں؟ میں خاص طور پر اُسے کہیں تلاش کرنے
ں گیا، وہ خود ہی مجھ سے آ ٹکرائی...... اب میں دل و دماغ کو کس طرح سمجھاؤں؟
نے کتنے دن اسی خیال سے میں اُن کے ہاں جانا چھوڑ دیتا ہوں، کہ شاید کسی طرح
سے بھولنے پر قادر ہو سکوں مگر افسوس! صد افسوس کہ اس کے خیال کو ذہن سے نکال
تا ہوں نہ کوئی دوسرا دل و نگاہ میں سماتا ہے۔ پھپھو جانی سینکڑوں چہرے دکھا دکھا کر
جز ہو گئیں!!"

پھوپھی جان کا خیال آتے ہی اُن کے دماغ میں ایک تجویز کوندے کی طرح لہرا
ئی۔

"وہ...... مارا...... بھاگوں علی جی اور نہ پھپھو جانی کالج کیلئے نکل جائیں گی۔"

انھوں نے پُر جوش انداز میں فضا میں مکّا لہراتے لہراتے "قصرِ دیدار" کی
ہائشی عمارت کی طرف دوڑ لگا دی۔

رانی کا پہلا پیریڈ فری تھا۔

ساتھی لیکچرارز سے ملنے اور اٹینڈنس لگانے کے بعد وہ لائبریری میں آ گئی۔ گھر
سے لائی ہوئی کتابیں واپس کرنے کے بعد وہ کسی کتاب کی تلاش میں الماریاں چیک

کرنے لگی حتیٰ کہ پہلا پیریڈ آف ہو گیا۔

وہ کلاس لینے کیلئے لائبریری سے نکلی ہی تھی کہ پرنسپل زیب النساء بیگم مخالف سے تیز تیز چلتی ہوئی آئیں اور اس کا ہاتھ تھام کر گویا ہوئیں۔

"اِدھر آؤ...... ہمیں تم سے ایک ضروری کام ہے۔"

رانی نے اُنھیں سلام کیا پھر ادب سے جواب دیا۔

"میڈم! سیکنڈ ایئر میں میرا پیریڈ ہے"

"اُنچیج کر دیا گیا ہے......"

اُنھوں نے فوراً جواب دیا اور اُن کا ہاتھ تھامے تھامے سیڑھیاں اُترنے لگیں۔ رانی کا دل سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پرنسپل صاحبہ اور یہ عجیب سا رویہ! اُلجھن میں گرفتار تھی وہ۔

"آج ضرور کوئی خاص بات ہے!"

اُس کی چھٹی حس چیخ چیخ کر اعلان کرنے لگی مگر وہ کشاں کشاں اُن کے ساتھ چلتی گئی۔ حتیٰ کہ دونوں "قصرِ دیدار" کے اندر داخل ہو گئیں۔ بڑی نشست گاہ پہنچ کر وہ مسکرائیں اور بالکل سامنے اشارہ کر کے دکھاتے ہوئے کہنے لگیں۔

"وہ دیکھو۔ وہ رہے تمہارے تینوں مجرم......"

رانی نے دیکھا، افروز جہاں اور شاہ جہاں کرسیوں پر نو کھا سا منہ بنا براجمان تھیں۔ اُس کی نظریں پھسلتی ہوئی علی پر ٹک گئیں جو در یچے کے قریب کھڑے بظاہر پائیں باغ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

زیب النساء بیگم نے رانی کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ مخاطب کیا کی آواز اور لہجے میں محبت اور شفقت کا پرتو تھا۔

"رانی بیٹی! ہم نے تمہیں کبھی شاہجہاں اور افروز جہاں سے کم نہیں جانا۔

رہا ہے ہمارے دل میں تمہاری محبت اور ممتا اپنی بیٹیوں کی سی ہے۔"

اتنا کہتے کہتے اُنھوں نے محبت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا۔

"سچ سچ بتانا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اپنا دل ٹٹول کر یہ بتاؤ' ہم نے جو کچھ کہا تمہیں اس میں مبالغہ آرائی تو نہیں لگی؟"

رانی کو بے حد شرم اور ندامت محسوس ہوئی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس فیملی کی بے پایاں محبتوں اور شفقتوں کے پھولوں سے اُس کی جھولی لبالب بھری پڑی تھی۔ ایسے بے لوث اور پُرخلوص لوگ کہاں تھے بھلا؟

اُس نے احسان مندی کے احساس سے نگاہیں جھکا لیں وہیرے دھیرے سے بولی۔

"میڈم!......"

زیب النساء بیگم نے فوراً اُس کی بات کاٹ کر ڈانٹا۔

"خبردار...... ہم "میڈم" نہیں بلکہ تمہاری بھی پھپھو جانی ہیں اور یہ کالج نہیں بلکہ گھر ہے۔ ہاں اب بولو کیا کہہ رہی تھیں۔"

اُس نے بدستور شرمندگی سے جواب دیا۔

"آپ کی نوازشوں' محبتوں اور مہربانیوں کو میں کبھی...... بھول نہیں سکتی...... یہ حقیقت ہے مجھے میرے اپنوں سے زیادہ آپ کی طرف سے شفقت اور خلوص کی دولت ملی۔ ممکن نہیں کہ میں اس حصار سے آزاد ہو سکوں۔"

دور کھڑے علی نے چونک کر اُس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا۔

دل میں خوشگوار دھڑکنیں سرسرانے لگیں۔

زیب النساء بیگم خوش ہو کر بولیں۔

"ان جذبوں میں ہمارا کوئی کمال نہیں بلکہ قدرت نے تمہارے اندر کوئی ایسا سحر

بھر دیا ہے کہ ہم سب تمہارے دیوانے ہیں۔ یہ لڑکیاں ہیں تو تم پر فدا ہوئی جاتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ سب آپس میں شیر و شکر تھیں۔ بس ادھر کچھ عرصے سے تم نے یہاں آنا جانا چھوڑ رکھا تھا......"

رانی خاموش رہی۔ کیا وضاحت کرتی! چپ چاپ بیٹھی رہی۔

زیب النساء بیگم نے ایک نظر اسے دیکھا پھر خود ہی بولیں۔

"تمہارے ملال اور کھنچاوٹ کو ہم بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ بے شبہ تمہارا مان جانا برحق ہے۔ تمہاری جگہ کوئی بھی اچھی اور سچی لڑکی ہوتی' اس کا یہی رد عمل ہوتا۔ لیکن ہم تمہیں بتائیں کہ صاحبزادے نے ہم سے سارے حالات پوری سچائی کے ساتھ بیان کر دیے تھے۔ اور بتایا تھا کہ کس طرح بس خراب ہو جانے کی بنا پر ایک شام تمہیں گھر چھوڑنے کیلئے گئے۔ تمہاری والدہ سے ملاقات سے ڈرامہ رچا کر دکھانے تک ہم ہر بات سے آگاہ ہیں۔ کوئی راز والی بات نہ تھی۔

ہم نے اس وقت چاہا تھا کہ تمہیں اندھیرے میں کیوں رکھا جائے؟! اگر اس ملاقات پر صاحبزادے نے نہیں بتایا تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بعد میں بھی بآسانی بتایا جا سکتا تھا کہ دراصل "صاحبزادہ دیدار علی خان" ہی بھی 'علی' بھی ہیں۔ مگر...... یہ دونوں آفتیں!"

انھوں نے ذرا سی دیر کو تھم کر ان دونوں کی طرف اشارہ کیا۔۔۔" یہ دونوں آفتیں کسی طور نہ مانیں۔

انھیں معلوم نہیں کیا لطف آ رہا تھا۔ بلکہ تینوں نے لمبی پلاننگ بنا ڈالی۔

آج ہم سوچتے ہیں کہ اصل کوتاہی ہم سے ہوئی کہ ہم ان کے کہے میں آ گئے بس کیا کریں۔ یہ دھیان نہ آیا کہ ان کا تو فقط کھیل ہو جائے گا اور دل تمہارا ٹوٹے گا ورنہ ہم سختی بھی کر سکتے تھے۔ مگر ہم سے بھول یہ ہوئی کہ ان کی رو سے ہٹ کر بظاہر

بیٹھ گئے۔"

پورے کمرے میں گہری خاموشی طاری ہو گئی۔

وہ پوری وضاحت کر کے چپ ہوئیں تو افروز جہاں اور شاہ جہاں جیسے سانس روکے بیٹھی تھیں۔

"اب صورتحال یہ ہے کہ حقیقت پر سے پردہ اٹھانے والے بھی یہ لوگ خود ہی ہیں پچھتا بھی خود رہے ہیں۔ انھیں سوائے لعنت ملامت کے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ شرارت کا بھوت اترا ہے تو ہمارے پاس دوڑے آئے ہیں سفارش کیلئے۔ اب ہم تم سے بھی کیا کہیں سوائے اس کے کہ چلو اب تم بھی ان لوگوں کی شرارت کو بھول جاؤ۔ نظر انداز کر دو۔ اور نہیں کچھ تو یہ سمجھ لو کہ تمہیں اپنا سمجھ کر یہ ڈرامہ کر لیا انھوں نے۔

اب دیکھو پریشان کس قدر ہیں اور پشیمان بھی!"

زیب النساء بیگم بہت دیر تک سمجھاتی بجھاتی رہیں۔

ان باتوں کے سوا انھوں نے دوسری کوئی بات نہ کی۔

یہ سب لوگ اپنے اپنے مقام پر اپنی اپنی سوچوں میں کھوئے رہے دخل کسی نے نہیں دیا۔ خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔

اصل میں تو آج کے اس واقعے کے محرک علی تھے۔ انھی کی پریشانی سے پریشان ہو کر وہ رانی کو ساتھ لے کر آئی تھیں۔ اور تمام باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ کر چلی گئیں۔

ان کے جاتے ہی سب سے پہلے افروز جہاں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ اور صدق دل سے بولی۔

"اچھی مہارانی جی! اب تو ہماری خطائیں معاف کر دو نا! کب تک سزا دو گی......"

شاہ جہاں نے بھی اُس تقلید کی اور خوشامد سے بولی۔

"دیکھو رانی۔ بھیا بھی کتنے چپ چاپ سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایک تو روز روز پر سے تمہاری خفگی۔ بس بھئی اب برداشت سے باہر ہے۔ چھوڑو ساری نا اور صلح کر لو۔"

افروز جہاں اُس کے گلے میں باہیں حمائل کر کے بولی۔

"حسنِ اتفاق دیکھو کہ اس دفعہ چاند کی چودہویں کو بھیا کی سالگرہ ڈھیروں کام ملتوی ہوئے پڑے ہیں۔ تمہاری ٹینشن میں کوئی کام بھی پایۂ تکمیل پہنچ پا رہا ہے۔ اب اتنی سنگدل مت ہو......"

علی اب تک رُخ پھیرے دریچے میں کھڑے تھے۔

رانی کی مسلسل خاموشی پر اب اُن کی بے چینی شدید قسم کی کوفت اور جھلا میں تبدیل ہونے لگی تھی۔

بالآخر اُن کی ساری خوش مذاقی اور چھیڑ چھاڑ مجروح ہو کر سنگین قسم کا غصہ گئی۔

دفعتاً اُنھوں نے نہایت شاکی نگاہ پتھر کی طرح ساکت بیٹھی رانی پر ڈالی او زور سے پیر پٹختے ہوئے چلے گئے۔

لڑکیوں کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ قدرے سراسیمگی کی سی کیف میں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگیں۔

لیکن......

اُن کے جاتے ہی رانی بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اور بیک وقت اُن دونوں کے ہاتھ تھام کر اطمینان اور شرارت سے بولی۔

"بس آج میرا بدلہ پورا ہو گیا......

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

میری آپ کی کوئی رنجش اور ناراضگی نہیں......

سب ٹینشن ختم......

صلح شروع۔"

چند لمحات کے بعد تینوں کے قہقہوں سے نشست گاہ میں پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔



خوب صورت وقت' خوب صورت لوگ' خوب صورت تقریب اور خوب صورت تجوگ والا معاملہ تھا۔

ظاہر ہے بڑے لوگوں کی تقریب تھی تو اعلیٰ ترین انتظامات بھی تھے۔ لیکن رانی کی زندگی کی عجیب و غریب تقریب تھی۔ اس لئے وہ قدرتی بات ہے بوکھلا بھی رہی تھی' کھسیا بھی رہی تھی۔ بھلا دنیا میں کوئی ایسی سالگرہ بھی ہوتی ہے جو بغیر تحفے کے منعقد ہو رہی ہو! پھر اِس جھنجٹ کی تُک کیا ہے! اس کی زندگی میں بھی پہلا چانس تھا کہ وہ لاکھ چاہنے کے باوجود خالی ہاتھ آئی تھی بلکہ خالی ہاتھ آنے پر مجبور کر دی گئی تھی۔ اور مجبور کرنے والی تھیں وہی دونوں صاحبزادیاں افروز جہاں اور شاہ جہاں۔

اُنھوں نے invetation card کے ساتھ اُسے صاف لفظوں میں آگاہ کر دیا تھا کہ۔

"بھیّا کا حکم خاص ہے کہ ان کی سالگرہ میں رانی کی طرف سے کوئی تحفہ قبول نہ کیا جائے۔ اگر وہ نہ مانے تو صاحبزادے کو دکھایا نہ جائے۔" اس توہین آمیز انتباہ کے بعد کہاں ممکن تھا کہ رانی اس تقریب سعید میں اپنی تذلیل کروانے کیلئے آ پہنچتی۔

مگر دوسری ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ دوسرا فرمان پہلے۔ فرمان کا بھی جدِ امجد واقع ہوا تھا جو علی کی پھوپھو جانی اور رانی کی پرنسپل محترمہ زیب النساء بیگم کی جانب سے جاری ہوا تھا۔

"اُس نامعقول اور نالائق کی ہرگز پرواہ نہ کی جائے۔ رانی بٹی تقریب میں لازمی اور بہر صورت شریک ہو اور بغیر تحفے کے شریک ہو۔ اگر نہ آ جائے تو زیب النساء بیگم کی شفقت و محبت سے خود کو آزاد جانے۔"

ان پے در پے عجیب و غریب باتوں نے رانی کو سخت کشمکش میں مبتلاء کر دیا۔ ذہنی کوفت نے اُسے نڈھال کر دیا۔

تاہم اُس نے تقریب میں شامل ہونے کو اوّلیت دی۔

بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے بغیر تحفے کے آنا بہتر خیال کیا۔ اس معاملے میں اُس کا غالب خیال یہی تھا کہ چونکہ اُس روز علی ناراض ہو کر پیر پٹختے ہوئے گئے تھے۔ اس لئے بہنوں سے ایسا کہلایا ہوگا۔

چنانچہ اُس نے بھی سالگرہ میں کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ شامل بھی اپنی پرنسپل صاحبہ کی خوشنودی کے لیے ہونا چاہ رہی تھی۔ باقی کچھ وہ سمجھنا چاہ رہی تھی نہ سمجھا تا۔

دراصل یہ معلوم ہونے کے بعد کہ علی درحقیقت ایک نواب زادہ ہیں وہ اندر سے ڈر کر رہ گئی۔ سہم سی گئی تھی۔

بڑے لوگوں کے بھیا نک روپ اُسے ساری زندگی کیلئے سبق دینے کیلئے کافی تھے۔ وہ بہت محتاط رہنا چاہتی تھی۔

چنانچہ اتنی بڑی اور اہم سالگرہ میں وہ جھلکتی سی آف وائٹ ساڑھی میں ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ بڑی سادگی سے چلی آئی۔

سالگرہ کے انتظامات جس اعلیٰ پیمانے پر ہوئے تھے' تقریب پر اُس کا جوبن اور نکھار بھی اسی نسبت سے تھا۔

جدید انتظامات کے ساتھ ساتھ زنانہ اور مردانہ نشست دو الگ الگ لان میں علیحدہ کر دی گئی تھیں۔ اندرونی قصر دیدار کے وسیع و عریض ہال میں تقریب کی اصل کاروائی کے انتظامات تھے۔ یوں بے پردہ خواتین کیلئے پابندی بھی نہیں تھی۔ مشترکہ گیٹ برابر استعمال میں تھا۔

خوش گپیوں اور نت نئی دلچسپیوں میں وقت پر لگا کر اُڑا اور مسرتوں کے پُرشور ریلے میں سالگرہ کیک کاٹا گیا۔

میز پر تحائف کے لگے ہوئے انبار رانی کی طبیعت مکدر کئے دے رہے تھے۔ لاکھ لاتعلقی کے باوجود اُسے بے حد تنگی کا احساس ہوا جیسے وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر بمشکل دبائے رہی۔ اتنی رونقوں اور گہما گہمی کے باوجود دل اندر سے خالی خالی سا لگا۔ آنکھوں کے سامنے ایک بڑا سا سوالیہ نشان ناچ ناچ کر سوال کرنے لگا۔

صاحبزادے نے مجھ پر ایسی پابندی کیوں عائد کی؟

فقط مجھ سے ایسی دشمنی......؟

اور اس قدر نظروں سے گرا دینے والا احساسِ برتری؟

اپنی گاڑی تو وہ لے کر آئی تھی۔ کھانے کے فوراً بعد جبکہ احباب اپنی اپنی دلچسپیوں میں کھوئے تھے اُس نے گھر جانے کا قصد کر لیا۔

اِسی خیال سے وہ اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگی کہ کہیں اُس کی پرنسپل صاحبہ دکھا دے جائیں تو وہ اس دل آزار محفل سے نکل بھاگیں۔

پوری تقریب میں علی نے تو اُسے نگاہ اُٹھا کر بھی دیکھنا گوارا نہ کیا تھا۔ اس وقت جبکہ زیب النساء بیگم کی تلاش میں تھی شاہ جہاں خود اُسے ڈھونڈتی ہوئی آ گئی اور

دیکھتے ہی بولی۔

''رانی! ابھی سے جانے کی کوشش مت کرنا۔ بارہ دری میں امی حضور بلا رہی ہیں تم کو......

پھر وہ اُسے خود بارہ دری کی سیڑھیوں میں پہنچا کر چلی گئی۔



"حلو رانی!"

کسی نے اُس کے شانوں پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اپنی طرف کھینچا۔ اُس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

علی اُس کے بہت قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"پھپھو جانی کو.... تلاش کر رہی ہو؟"

رانی نے ناگواری سے خود کو اُن کی گرفت آزاد کیا۔ ہٹ کر جواب دیا۔

"میں کیا تلاش کروں گی باغ میں آ کر۔ اُنھوں نے خود ہی بلایا ہے۔ آپ سے مطلب؟" علی اُس کا جارحانہ انداز نظر انداز کر کے بولے۔

"بلایا تو مجھے بھی ہے۔ شائد ہم دونوں سے کام ہو۔ چلیے ہم اُنہیں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ میں بھی دوستوں کو چھوڑ کر آیا ہوں۔"

پہلے تو رانی نے سوچا۔ "انکار کر دوں!" پھر کچھ سوچ کر ساتھ ہو لی۔

دونوں دھیرے دھیرے قدم ملا کر چلنے لگے۔

تھوڑی دیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ بول پڑی۔

"کمال ہے کہاں چلی گئیں بلوا کر؟ مجھے واپس بھی جانا ہے۔"

لیکن زیب النساء بیگم وہاں ہوتیں تو ملتیں!

دم بدم بڑھتی رات سے رانی کو پریشانی بھی بڑھ رہی تھی۔

"چلیے ایک نظر وہ سامنے فوارے کی طرف دیکھ لیتے ہیں شائد وہاں ہوں۔" علی نے سرسری انداز میں رائے دی۔

اب سوائے اس کے چارہ بھی نہ تھا۔ وہ بے سمجھے بوجھے اُن کے ہم راہ اتنی دور نکل آئی تھی کہ تنہا واپس چلے جانا محال تھا۔ آس پاس کوئی دوسرا دکھائی بھی نہیں دیا تھا۔ یوں بھی "قصرِ دیدار" کے اِس حصے میں آنے کا اُسے پہلی مرتبہ اتفاق ہوا تھا۔

دونوں آہستہ آہستہ پختہ روش پر چلنے لگے۔

چاند اُبھر کر بالکل سامنے آ گیا تھا۔ فضائیں ایک پُر اسرار سحر سے دم بخود تھیں دودھیا چاندنی کی اُجلی اُجلی کرنیں ہر نظارے پر نثار ہونے لگیں۔ عطر بیز ہواؤں کے جھونکے اُن کے آس پاس سرگوشیاں کر رہے تھے۔ دونوں فوارے کے قریب پہنچ کر تھم گئے۔ رانی بے دھیانی میں بغور دیکھنے لگی۔ مرکری ٹیوبز کی روشنیوں میں فوارے سے شفاف پانی کی جھالریں اُچھلتے موتیوں کی بوچھاڑوں کی طرح برس برس کر بکھر رہی تھیں۔ بہت ہی سحر آفریں اور متحیر کر دینے والا منظر تھا جو لمحہ بھر کیلئے دماغ کو مسحور کر دیتا تھا۔ رانی نے دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے سوچا۔

"یہ نظارے بھی بڑے لوگوں کی نگاہوں کو تراوٹ پہنچانے کیلئے ہیں۔ عام

لوگوں کو اس سے کیا واسطہ؟"

اُس نے بادل نخواستہ اُدھر سے نظریں ہٹالیں۔ کچھ کہنے کو تھی کہ اچانک علی نے ایک گہری سانس لی پھر اُس کے بالکل سامنے آ کر پوچھا

"رانی! ایک بات سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم نے مجھے واقعی معاف کر دیا ہے؟"

اُن کے اچانک بدلتے رویے اور سوال سے رانی ٹپٹا گئی۔

تاہم اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

"اِس وقت ایسے سوال جواب کا کیا موقع ہے؟ چلیے واپس چلتے ہیں آپ کی پھپھو جانی تو کہیں بھی موجود نہیں ہیں۔"

علی نے آگے بڑھ کر کمال جرأت سے اُس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور قدرے سخت لہجے میں گویا ہوئے۔

"اُن کی تلاش چھوڑ دو۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہوں گی۔ یہاں دراصل تمہیں میں نے بلوایا ہے۔ ویسے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں آدم خور نہیں ہوں۔ جو دریافت کر رہا ہوں اس کا صاف صاف جواب دو۔"

رانی کے بے اختیار اپنے ہاتھ چھڑواتے ہوئے افسوس اور گھبراہٹ میں کہا "تو...... یہ کہیے نا کہ سارا چکر آپ کا چلایا ہوا ہے۔ بس چھوڑیے میرے ہاتھ مجھے فوراً واپس جانا ہے۔"

"چھڑا سکو تو چھڑا لو۔"

علی نے بڑی ڈھونس سے کہا اور اُس کو تقریباً کھینچتے ہوئے فوارے کی سیڑھیوں لا بٹھایا۔ پہلی سیڑھی پر ایک پاؤں ٹکا کر قطعیت سے بولے

"نہیں...... میں ہرگز جانے نہ دوں گا۔ خواہ اِسی طرح پوری رات کیوں

بیت جائے!"

رانی پوری جان سے کپکپا کر رہ گئی۔

وہ اُس پر مزید جھک کر بولے۔

"آج تمہیں...... مجھے معاف کرنے کا انکار کرنا ہوگا یا اقرار...... تیسرا کوئی بھی رویہ ناقابل قبول ہے۔ بائی گاڈ! تم نے مجھے ہر ہر پل انگاروں پر تڑپایا ہے۔ اور ایک یک لمحے کا بہت جان لیوا انتقام لیا ہے۔ اب بتاؤ! بولو! مجھ سے وہ کون سا ناقابل معافی گناہ سرزد ہو گیا ہے کہ تم نے بات کرنا ترک کر دی۔ میری ہزار خوشامد کا تم نے ذرہ برابر اثر نہیں لیا؟ مگر آج...... ان لمحات میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم آخر کب تک زبان استعمال نہیں کرتیں۔ آج کی تاریخ میں میں نے بھی اپنے آپ سے عہد کیا ہے کہ خواہ میری یا تمہاری جانوں پہ کیوں بن جائے۔"

رانی کے کاٹو تو لہو ندارد۔

اُن کی باتیں اور ارادے سن کر ساکت رہ گئی۔

اتنے عرصے کی ملاقات میں اُن کی ضد اور خودسری سے واقف تھی۔ خوب آگاہ تھی کہ جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل کرنے بیٹھ جاتے تو تعجب نہ تھا۔

لمحوں میں اُس نے خود کو سنبھالا۔ اپنے خوف اور نہ معلوم گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے سمجھوتے کا ارادہ کیا۔

اِس تنہائی کے ماحول میں وہ کسی رسک کیلئے تیار نہ تھی۔ یوں بھی اب اُس کے دل میں اب اُن کی طرف سے رنجش اور ملال نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اُس نے بہت پہلے ہی دل کے بجائے دماغ سے فیصلہ کر لیا تھا کہ جس راہ پر چلنا نہیں ہے اُس کے کھوٹے ہونے کا ملال کیا؟

اُس نے نہایت سمجھداری سے کام لیتے ہوئے طبیعت پر اُن کی طرف سے

طاری بے زاری اور انجانے خوف کو جھٹک دیا۔ یہ وہی علی تو تھے جن سے گھنٹوں ڈرائیونگ سیکھتی رہی تھی۔ جو آزادانہ اُس کے گھریلو ماحول میں دخل انداز رہے تھے اور جن پر اُس کی اپنی ماں بے پناہ بھروسہ کرتی تھیں۔

یہ سب سوچ کر وہ تھوڑا مسکرائی اور مصالحانہ انداز میں کہنے لگی۔

"آپ تو...... اس طرح معافیاں تلافیاں مانگ رہے ہیں جیسے بہت بھاری مجرم ہوں۔ اگر آپ کا یہی منشاء ہے تو میں بتاتی ہوں غالباً افروز اور شاہ جہاں نے آپ کو لاعلم رکھا ہے۔ میں نے اُسی دن یہ معاملات خفگی و ناراضگی کے ختم کر ڈالے تھے جس روز آپ کی پھپھو جانی مجھے کالج سے اپنے ساتھ اندر لے کر آئی تھیں۔ آپ خود ہی...... ناراض ہو کر چلے گئے تھے۔"

علی کا چہرہ کھل اُٹھا۔

بے پایاں دلی مسرتوں کا پرتو سوئی سوئی آنکھوں میں جاگ پڑا۔

بے ساختہ چہک کر پوچھا۔

"گویا...... تم نے مجھے معاف کر دیا؟ میں سمجھا تھا کہ وہ دونوں بک رہی ہیں۔" اتنا کہتے کہتے وہ ایسے موڈ میں آئے کہ سرشاری کے عالم میں اس کے برابر سیڑھی پر آ بیٹھے اور بے تکلفی سے بولے۔

"ویسے ایک بات ہے رانی! اس طویل ڈرامے میں لطف بہت آیا...... اُفوہ! میں نے زندگی بھر کسی بات سے ایسا بھرپور انجوائے نہیں کیا۔ پہلے پہل تو تمہارے اُلجھنے کے خیال سے میں نے ان دونوں چڑیلوں کی مخالفت کی تھی اور یہی ارادہ تھا کہ از خود تم پر حقیقت کا اظہار کر دوں گا مگر اس وقت اُن دونوں نے میری ایک نہ چلنے دی۔ بعد میں تو پھر مجھے بھی ـــ مزہ آنے لگا۔ یاد ہے تم کو وہ بارش والی سرد شام ..... انھوں نے ذرا تھم کر زوردار قہقہہ لگایا۔ شرارت سے بولے۔

"تول تو بارش اور بجلی اور پھر بھیگ جانے سے تم بہت نروس ہو رہی تھیں۔ اوپر سے میری باتیں! بھئی واہ! مزہ آ گیا تھا۔ پھپھو جانی کے خلاف میرا کچھ کہہ دینا اور وہ تمہارا بھڑک جانا...... میرے پاس وہ مکمل کیسٹ اب تک محفوظ ہے۔ تمہارے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سب ٹیپ کر لیا تھا میں نے!! تمہیں یاد ہے اور کیا سمجھاؤں!!"

رانی حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی۔

علی کو اس وقت بات بے بات ہنسی آئے چلی جا رہی تھی۔ اُس کی حیرانگی سے حظ اٹھاتے ہوئے بولے۔

"میں ـــ تمہاری وہ باتیں پھپھو جانی کو بھی سنوائی تھیں۔ اسی کے بعد سے تو وہ تم کو...... بہت زیادہ چاہنے لگی ہیں۔"

رانی کچھ بول نہ سکی۔ اُن کی طرف سے رُخ پھیر لیا۔ اب اُن کی کن کن باتوں کا ذرا سا تجزیہ! انھوں نے تو جیسے آج ہر بات کو اُس کی آخری حد تک پہنچانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ معلوم نہیں کیا کیا سوچے بیٹھے تھے۔

اپنی بے پناہ خوشیوں کے ہجوم میں سگریٹ سلگایا اور گہرا کش لیکر پوچھا۔ "سچ کہو رانی! 'جشن بہاراں' کی شام تم افروز بے چاری سے اتنی چڑ کیوں رہی تھیں؟ نہ معلوم کیوں مجھے لگا کوئی خاص خفگی ہے۔"

رانی کو ان کی یاد دہانی پر بہت کچھ یاد آ گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دفعۃً وہ کہہ گزری تاہم لہجہ کسی خاص تاثر سے خالی تھا۔

"شائد آپ کا خیال ہے کہ آپ دونوں کو میں نے "جشن بہاراں" پر پہلی دفعہ ایک ساتھ دیکھا تھا؟ جی نہیں۔ بلکہ میں بہت پہلے ایک یادرہ جانے والا منظر دیکھ چکی

تھی۔ البتہ ”جشن بہاراں“ کی شام سے قبل بس یہ سوچ کر رہ جایا کرتی تھی کہ ممکن ہے میرے ذہن ونظر کا فتور ہو۔“

علی الجھ کر رہ گئے۔

سگریٹ سلگا چھوڑ کر اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

اب ستانے کی باری رانی کی تھی۔ ان کی بے چینی سے لطف لینے لگی۔ خاموش بیٹھی رہی۔

”کہو نا..... کیا کہہ رہی تھیں؟“ علی نے دریافت کیا۔

ان کی حیرت اور فکر مندی برقرار تھی۔

تب وہ ان کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے دھیرے دھیرے بتانے لگی۔ ”یاد کیجئے اس رات کے لمحات۔ جب ایکسیڈنٹ کے بعد مجھے آپ ”قصرِ دیدار“ میں لے آئے تھے اور وہ شاید آپ کی خوابگاہ ہوگی۔ وقت تو معلوم نہیں مگر اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔“

وہ انہیں اپنی الجھن اور اتنے عرصے پہلے کا دیکھا ہوا منظر بتانے لگی۔ علی کسی سوچ میں گم، پیشانی پر بل ڈالے سنتے رہے۔

بات کے اختتام پر بے اختیار انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

”ارے دوست! تب تو تم نے بہت ہی ذہنی اذیت برداشت کی..... جبھی تو شدید بیمار پڑ گئی تھیں۔ او مائی گاڈ! مجھ سے تو بہت زیادہ متنفر ہو گئی تھیں۔ اب سمجھ آئی تغافل مسلسل کی وجہ۔ او بیوقوف لڑکی! یہ سارے طوفان کانٹوں کی طرح دل میں کیوں چھپا لیے؟ مجھ سے تو پوچھا ہوتا! اور کیا تمہیں نہیں معلوم کہ تم اور افروز کزن ہونے کے علاوہ دودھ شریک بہن بھائی بھی ہیں!

رانی کے چہرے سے سایہ سا گزر گیا۔

تاہم مسکرا کر جواب دیا۔

”بتانے یا پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کیونکہ میرے اور آپ کے درمیان بے تکلفی ضرور تھی۔ مگر اس حد تک تو نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے ذاتی معاملات میں دخل انداز ہونے لگیں۔“

”یہ دخل اندازی کی خوب رہی“ وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

”تم نے اتنی اہم اور بڑی بات دل میں چھپائے رکھی اور ہمارا حال ملاحظہ ہو کہ ان ”زبیر علی“ سے تمہارے رشتے کی بات سن کر ہی ہم نے ان کی اپنی جان ایک کرنے کے ہزار منصوبے بنا لیے تھے۔ محض اسی وجہ سے ”جشن بہاراں“ پر میں جلد بازی سے کام لے کر حقیقت پر سے پردہ نوچ پھینکا تھا۔ حالانکہ اس دن جو خدشہ مجھے تھا وہ بھی بالآخر وقوع پذیر ہو گیا تھا..... یعنی تمہاری طبیعت کا اچانک بگڑ جانا..... مت پوچھو کہ اندر سے کیا حال تھا میرا..... وہ تو پھوپھو اماں جان نے اپنی سادہ لوحی میں خود ہی بتا دیا تھا کہ تم نے رشتے سے انکار کر دیا ہے.....“

رانی حیرت اور تاسف سے انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

علی کی خوش گمانی، خوش گفتاری اور خوش فہمی پر اسے دکھ بھی ہو رہا تھا، افسوس بھی۔ شاید کیا سچ وہ سمجھ رہے تھے کہ زبیر علی کے رشتے سے انکار رانی نے ان کی وجہ سے کیا ہے۔

رانی نے کڑھتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا۔

”ان بے چاروں کو ہمارے گھریلو حالات کا کیا علم؟ ان کو کیا خبر کہ اپنوں سے ہی ڈسے ہوئے لوگ ساری عمر کسی پر اعتماد کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ پھر موضوع بدلتے ہوئے بولی:

”پتہ نہیں آپ یہ پرانی باتوں کا ذکر کیوں لے بیٹھے۔ یہ بتایئے سالگرہ پر تحفہ

لانے سے روک دینے میں کیا راز تھا؟ میرے بغیر کوئی بھی بغیر گفت کے آیا؟ اگر میں ایسی ہی حقیر اور نااہل ٹھہری تو اہمیت کیوں دیا؟

وجاہت علی کا موڈ بدل گیا۔ چہرے کی شگفتگی اور تازگی سنجیدگی میں بدل گئی۔ وہ جیسے کہیں کھو گئے۔

رانی نے تعجب سے اس تبدیلی کو نوٹ کیا مگر بولی کچھ نہیں۔ حتیٰ کہ وہ اس کے قریب سے اٹھ کر بستر سے پرے ٹہلنے لگے۔ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتے رہے۔ ختم ہوتی سگریٹ نے انگلیاں جلائیں تو اسے دور پھینک دیا اور چونک کر اس کے قریب آ رکے۔

وہ جو اس کا موڈ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی قبل اس کے کہ متوحش ہوتی، انہوں نے جذب کی جانے کن منازل کو طے کرتے ہوئے اس کا دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا اور مدھم سروں میں بولے:

"رانی! آج اتنی ... طویل کے بعد بھی میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تمہارے دل میں میرے لیے کیا مقام ہے؟ یہی سوال مجھ سے پھپھو جانی نے دوسری طرح کیا تھا۔ لیکن جب میں ذاتی طور پر خود بھی اس سوال کے جواب سے آگاہ نہیں تو ان سے کیا عرض کرتا۔ لیکن رانی! جب میں اپنے اندر جھانکتا ہوں اور حالات کا اندازہ کرنا چاہتا ہوں تو میں اپنی کیفیت کس طرح بیان کروں؟ لفظوں کا تمام خزانہ ختم ہو جائے مگر میں اپنا جذبہ، اپنا مدعا اور اپنا نقطہ نظر تم پر بیان نہ کر پاؤں گا۔

مجھے اعتراف ہے کہ مجھ میں اس سلیقے اور حوصلے کا فقدان ہے میں تو بس یہ ہوں کہ ... تم صرف اور صرف ... میرے لیے تخلیق کی گئی ہو۔

میں پھپھو جانی کو ان کے سوال کا جواب تم سے اس اہم ترین ملاقات کے

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

دینا چاہتا تھا۔

جب میں نے اماں جان کی زبانی یہ سنا کہ تم نے اپنے ابو کی خواہش کا احترام و لحاظ نہ رکھا اور اس پیغام کو رد کر دیا تو میرے سر پھرے جذبوں نے مجھے پکار پکار کر یہی وجہ سمجھائی کہ یقیناً میرے لیے تم اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ چھپائے ہوئے ہو۔

یہی سبب ہے کہ اس زمانے میں میں نے تمہارے ہاں آنا ترک کر کے خود اپنے آپ کو ٹٹولا۔ بیشک میری خاندانی روایات عام لوگوں سے مختلف ہیں، لیکن ایسی بھی نہیں کہ مجھے اپنے دلی فیصلوں اور خوشیوں کی بھینٹ چڑھانی پڑ جائے۔ میرے بزرگ اپنی اولاد کی مسرتوں کا گلا گھونٹنا نہیں بلکہ ان کی جھولی من چاہے پھولوں سے لادنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ اتنے دنوں کی دوستی نے یقیناً تمہیں بھی ان کی طرف سے اطمینان دلا دیا ہوگا۔ ہم کھلے دل اور کشادہ ذہن لوگ ہیں۔ تعصب، نفرت یا بے زور و جبر ہمارے قریب سے بھی ہو کر نہیں گزرا ہے۔

بت کی طرح ساکت بیٹھی رانی کے آس پاس سینکڑوں جلتے بجھتے جگنوؤں کا ال تھا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وقت و حالات کا شمار تھا نہ احساس......

ایک سیکنڈ سے بھی کم مدت تھمنے کے بعد علی دوبارہ بولنے لگے:

"آج ...... میں تم سے فقط یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ...... میں تم سے تمہارا خواستگار ہوں۔ میں تم سے تمہارا طالب ہوں رانی! خدا گواہ ہے میں تم سے رٹ نہیں کر رہا، فقط تمہاری رضامندی چاہتا ہوں میں نے یہ فیصلہ خوب سوچ کر کیا ہے۔

یہ وہ فیصلہ ہے، جس نے مجھے ملکوں ملکوں گھومنے کے باوجود ہر خرافات اور برائی

سے محفوظ رکھا۔ میں پھپھو جانی کو خود اماں جان کے حضور لے کر جاؤں گا۔ ان کے سامنے اپنی درخواست دہرانے کے لیے۔ لیکن اس سے قبل تمہاری رضامندی اور خوشی بلکہ اجازت درکار ہے۔

تم سے تحفہ لانے کو اسی لیے کہا تھا کہ آج کے دن، میرے نزدیک سب سے قیمتی، سب سے انمول اور سب سے گراں قدر تحفہ تم خود ہو...... آج تم سے...... تمہی کو مانگنے کا ارادہ ہے۔ مجھے مل جاؤ۔ پھر کسی نعمت کی ہوس باقی نہ رہے گی...... چونکہ میری سالگرہ میں خالی ہاتھ آئی ہو، جبکہ تمہیں بھی یہی شکوہ ہے۔ کیونکہ یہ رسم دنیا بھی ہے...... اس لیے......"

علی نے الفاظ ادھورے چھوڑ کر بے اختیار اس کا ہاتھ لبوں سے چھو لیا۔ رانی نے تڑپ کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

نرم و گداز جذبات کی شبنم میں بھیگے بھیگے، نرم ملائم لہجے کی شیرینیوں میں ڈوبے ڈوبے اور احساسات کی سحر انگیز آنچ میں سلگے سلگے الفاظ رانی پر خوشبو سے اٹی پنکھڑیوں کی مانند نچھاور ہو رہے تھے۔

ایک حسین، طرحدار، دولت مند، اونچی فیملی اور اعلیٰ ترین اسٹیٹس کا حامل اس کا طلبگار تھا۔ بہت ساری محبتوں، بے شمار چاہتوں اور اپنے بھرپور پیار کا یقین رہا تھا۔

لیکن رانی کی نگاہوں کے سامنے ابو اور اماں جان کے ڈوبتے ابھرتے چہرو عکس گڈمڈ ہونے لگا۔ منزل ہمک ہمک کر اسے گلے لگانے کو بے قرار تھی۔ سنہرا روپہلا مستقبل بالکل قدموں میں پڑا جگمگا رہا تھا۔

اپنے الفاظ کا تمام تر خزانہ اس کے چرنوں میں ڈال دینے کے بعد علی اس طرف منتظر نگاہوں سے تک رہے تھے۔ خوبصورت آنکھوں میں آس و نراس

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

ہزاروں دیپ ٹمٹمانے لگے تھے۔

رات دھیرے دھیرے، بچ بچ قدم بڑھا رہی تھی۔

چاند جیسے بالکل قریب آ کر انہیں تکنے لگا۔

بھیگی رات کے اس پہر "قصرِ دلدار" کے پائیں باغ پر ایک گہرے سکوت کا عالم طاری تھا۔ پتہ پتہ ہمہ تن گوش تھا۔ جیسے ہر کوئی کان لگا کر رانی کے فیصلے کے انتظار میں ہو۔

لیموؤں کے جھکے جھکے پیڑوں میں سرسرانے والی ہواؤں کے جھونکے، رات کی رانی اور مہندی کی دل نواز مہک کے ساتھ مل جل کر جیسے سحر آفریں سرگوشیاں کرنے میں مصروف تھے۔

"دیکھ رانی! کسی کا امنگوں بھرا دل مت توڑنا۔ دیکھو! ذرا سنبھل کے!! یہ گناہ نہ سرزد ہو پائے تجھ سے، ورنہ یہ جان لے کہ پھر عمر بھر پچھتاوے کے دیپ جلائے گی، جو تیرے ہی خونِ جگر سے جلیں گے اور پھر جلتے ہی رہیں گے۔ محبتیں اور چاہتیں زندگی میں بار بار نہیں ملا کرتیں، بلکہ کبھی کبھار ہی نصیبوں سے ملا کرتی ہیں ان پاک لمحوں اور انمول گھڑیوں کو غنیمت جان اور آگے بڑھ کر دامن میں بھر لے۔ دیکھ ناشکری مت بن۔ ورنہ راکھ کے اڑتے ڈھیر کے سوا کچھ نہ باقی رہے گا!!"

عین اس لمحے جب کہ وہ کشمکش کے عذاب سے دوچار تھی، تو زبیر علی کا ان دیکھا، اور قریب بیٹھے علی کا چہرہ اور چہرے کے نقوش اسے ایک جیسے لگنے لگے۔ گویا علی زبیر ہوں یا زبیر علی ہوں۔ جیسے ایک ہی شخصیت کے الگ الگ نام ہوں!! اس کی نظر میں یہ دونوں شخصیتیں اس کے ابو کی طرح اونچے عہدوں پر فائز اور اس کے لیے ناقابلِ قبول تھیں۔ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

"تو سے میں نے زبیر علی کے رشتے سے انکار کیوں کیا تھا؟"

معاً اسے یوں محسوس ہوا گویا زمانہ بیس برس آگے کی طرف پرواز کر گیا ہو۔ وہ اماں جان کی طرح وحشت زدہ چہرہ گرد آلود بالوں کے ساتھ سونی باہیں لیے تنہا کھڑی ہے۔ اور اس سے میلوں کے فاصلے پر علی کھڑے ہیں...... مگر...... ان کے چہرے پر ملال کا چہرہ فق ہے!

رانی گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا رانی!" وہ بھی اٹھ کر اس کے برابر کھڑے ہو گئے۔

دودھیا، جھلملاتی روشنیوں میں ان کی آنکھیں ہیروں کی مانند چمک رہی تھیں۔ جن میں اس کے قرب کا اثر خمار بن کر تیر رہا تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس کا نرم و نازک ہاتھ تھامنا چاہا۔ مگر رانی صاف نظر انداز کر گئی۔ اور اس سے قدرے دور ہٹ کر آہستہ سے بولی:

"...... آپ کی ساری باتیں میں نے بغور سنی ہیں۔ ایسا مت جانیے کہ کان لپیٹے بیٹھی تھی۔ مگر...... اس نے نگاہیں اٹھا کر علی کی طرف دیکھا، لیکن ٹھٹھک کر رک گئی...... شاید کوئی جھجک آڑے آ رہی تھی۔

علی بے قرار ہو کر اس پر جھک پڑے اور بے تابی سے دریافت کیا:

"ہاں ہاں کہو...... بولو...... مگر کیا؟"

"کچھ نہیں......"

رانی نے دبا دبا سا سانس لیا۔ پھر کسمسا کر سنبھل کر بولی:

"اس وقت تو...... آپ مجھے جانے دیجئے۔ یقین کیجئے میں باوجود کوشش کے بھی کچھ نہیں بول سکتی۔ کل آپ کو میرا مفصل جواب مل جائے گا۔"

"مفصل جواب!"

علی متحیر ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگے۔

"جی ہاں"

رانی نے ان سے نظریں ملائے بغیر دوبارہ کہا اور فوراً جانے کے لیے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

علی لپک کر اس کے راستے میں حائل ہو گئے اور پریشان ہو کر پوچھا:

"کیا ہوا رانی؟ مجھ سے خفا ہو گئیں! دیکھو میں نے تو اپنے دل کی ہر بات صاف صاف تم سے کہہ دی ہے۔ اور معذرت بھی پہلے ہی کر لی ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے تمہیں میری گزارشات گراں گزری ہیں۔"

وہ چپ رہی۔ بولی کچھ نہیں۔

بتاؤ نا رانی۔ خاموش کیوں ہو؟"

علی دوبارہ اصرار کر کے پوچھنے لگے۔

"تمہیں میری...... کونسی جسارت بری لگ گئی؟ ویسے تو میں مانتا ہوں آج میری جراتوں میں بے باکی اور روانی تھی۔ لیکن یقین کرو کسی بات میں جھوٹ یا دل لگی کی ہلکی ترین رمق بھی نہیں تھی۔ بس میں نے اپنا حال دل کھول کر تمہارے سامنے بیان کر دیا ہے۔ اب فیصلہ کا تمام تر اختیار بہر حال تمہی کو ہے۔ اسے اپنے قدموں سے روند ڈالو یا قدر دانی سے سنبھال کر رکھ لو۔

مگر یہ جو تم نے کہا کہ "مفصل جواب" تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر ہو سکے تو

وضاحت کردو۔"

اتنی دیر میں وہ پہلی دفعہ مسکرائی۔

"آپ تو بال کی کھال نکال رہے ہیں۔کل آنے گی تو جواب بھی انشاءاللہ مل جائے گا۔ابھی تو آپ میرے رہنما بن کر راستہ دکھائیے۔"

"کیوں نہیں" وہ اچانک صاحبزادہ دیدار علی بن کر سنجیدگی سے بولے:

"یہ رہنمائی آپ ہمیشہ کے لیے ہمیں سونپ سکتی ہیں، بے فکر ہو کر۔"



سنگی ستونوں اور چکنے چمکدار ٹائلوں والے "قصرِ دیدار" کے در و دیوار پر گہرا سناٹا طاری تھا۔

آسمان پر گہرے گہرے سیاہ بادلوں کے پرے جمع ہو رہے تھے۔ہواؤں میں سنسناہٹ پیدا ہونے لگی تھی۔صبح سے ہی موسم کے تیور بدل گئے تھے۔ایک دم ہی زیرِ دست تغیر آیا تھا۔مگر "قصرِ دیدار" کے مکین ہر تبدیلی سے بے خبر اپنی اپنی خوابگاہوں میں بند خوابِ غفلت کے مزے لوٹ رہے تھے۔جشنِ سالگرہ کے پُررونق ہنگاموں نے سب کو تھکا ڈالا تھا۔رات تک جاری رہنے والے فنکشن اور جگار کا نتیجہ تھا یہ بھی۔

جاگنے والے صبح سحری تک جاگے تھے اور روزہ رکھ کر نماز اور تلاوت کے بعد ہی نیند آئی تھی۔زیب النساء بیگم تو آج سرے سے کالج گئی نہ تھیں۔حالانکہ وہ شاذ و نادر ہی کبھی تعطیل کرتی تھیں۔

بادلوں سے بھرے بھرے آسمان تلے برفانی ہواؤں کے جھکڑوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔سردی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔منجمد کر ڈالنے والی فضا میں اونگھ رہی تھیں۔

صاحبزادہ دیدار علی ایک لمبی اور گہری نیند لے کر بیدار ہوئے تو دیگر لوگ تب تک نیند کی وادیوں میں مست خرام تھے۔

وہ بستر سے نکل کر آتش دان کے قریب ایک آرام دہ کرسی پر نیم دراز کسی انجانی فکر اور سوچ میں لگ رہے تھے۔ آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل بوجھل تھیں۔ جن میں ہلکی سی بے چینی کا تاثر تھا۔

دفعتاً "قصرِ دیدار" کے قدیم گھڑیال نے دن کے دو بجنے کا اعلان کیا۔ عین اس وقت کسی نے ان کی خواب گاہ کے کواڑ پر ہلکی سی دستک دی۔

علی نے چونک کر دیکھا۔

ان کا ملازم خاص "شاداب خان" "با ادب با ملاحظہ" کے انداز میں ایک خوبصورت طشتری تھامے کھڑا تھا۔ جس میں ایک سفید رنگ کا سادہ لفافہ رکھا تھا۔

انہوں نے بولے بغیر ہاتھ بڑھا کر طشتری سے لفافہ اٹھا لیا۔ شاداب خان پلٹا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

علی نے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ لفافے پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ سمجھ میں نہ آنے کے باوجود انہوں نے لفافہ چاک کر دیا۔

اب اس میں سے نکلنے والا پرچہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ یہ بھی سفید رنگ کا ایک نفیس کاغذ تھا۔ جو ہر طرف سے بالکل کورا تھا، فقط درمیان میں ایک شعر لکھا تھا:

"کسی سرنگوں سی ڈالی پہ رکھیں گے چار تنکے
نہ بلند شاخ ہوگی نہ گرے گا آشیانہ"
آر۔ایم

علی بھونچکے ہو کر دوبارہ پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔
سہ بارہ پھر پڑھنے لگے۔

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

وہ حروف ہی کتنے تھے، جنہیں پڑھنے میں دیر لگتی! البتہ سمجھنے میں تاخیر پہ تاخیر ہونے لگی تھی۔ آنکھوں سے نیند کا خمار یکلخت اتر گیا۔ بے تابی اور بے کلی میں اضافہ ہو گیا۔

وہ اس مختصر ترین تحریر پر نظریں جمائے جمائے نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ پڑھتے پڑھتے، غور کرتے کرتے، انہیں یہ تحریر بہت جانی پہچانی سی لگنے لگی۔

آر۔ایم......... آر۔ایم

انہوں نے بار بار منہ ہی منہ میں دہرایا۔

یکا یک ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ یوں گویا قریب میں بم پھٹ گیا ہو۔

انہیں یاد آ گیا

رات ہی تو رانی نے ان کی ڈھیروں باتوں کے جواب میں کہا تھا:

"کل آپ کو میرا مفصل جواب مل جائے گا۔"

گویا یہ آپ کا مفصل جواب ہے!

انہوں نے دماغ پر زور دے دے کر سمجھنے کی کوشش کرنا چاہی

"کسی سرنگوں سی ڈالی پہ رکھیں گے چار تنکے
نہ بلند شاخ ہوگی نہ گرے گا آشیانہ"

اضطراب کے عالم میں وہ اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ پھر بلند تر آواز میں ملازم کو دو چار لگاتار آوازیں دے ڈالیں۔

ایسا زندگی میں اوّل بار ہوا تھا۔

یوں تو وہ "قصرِ دیدار" میں بہت کم عرصہ رہے تھے، تاہم کسی نے انہیں کبھی اونچے اور ناشائستہ انداز میں بولتے نہیں سنا تھا۔

شاداب خان پہلی آواز میں آ موجود ہوا تھا۔ اور سامنے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"شاداب خان!"

انھوں نے کڑے لہجے میں دریافت کیا۔

"تمھیں یہ لفافہ...... کون دے کر گیا؟"

اُس نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"ج...... جی...... صاحبزادہ...... وہ کالج کا چپراسی تھا جناب!"

"اوہ......"

اُن کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

مگر فوراً ہی فیصلہ کن انداز میں گویا ہوئے۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ اور ہاں ہماری گاڑی باہر نکلواؤ۔"

"جی بہت بہتر"

شاداب خان کی جان میں جان آئی۔ وہ تیزی سے رخصت ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب ان کی گاڑی "قصرِ دیدار" کے عظیم الشان پھاٹک سے نکل رہی تھی تو دور بغلوں میں ہاتھ دیے کھڑا شاداب خان دل ہی دل میں پچھتا رہا تھا۔

"کاش! میں صاحبزادے کو روک سکتا!

آج موسم کے تیور بہت زیادہ بگڑے ہوئے ہیں۔

آج یقیناً میری شامت آ کر رہے گی!!"

اور یہ حقیقت بھی تھی۔ وہ تو کہو زیب النساء بیگم اپنی خواب گاہ میں بے خبر محوِ استراحت تھیں، ورنہ حشر ہو جاتا کہ صاحبزادے کو اس کڑے موسم میں گاڑی نکالنے کی اجازت ملتی۔

پھاٹک سے نکلتے ہی علی کی گاڑی کو طوفانی جھکڑوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے

ساتھ ہی ساتھ شدید قسم کی بارش نے آلیا۔

شفاف ونڈ سکرین پر پانی کی جھالریں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگیں۔ حدِ نگاہ تک لہراتی بل کھاتی ہوئی سرمئی سڑک بے حد پھسلنی ہو گئی۔ چنانچہ انھیں گاڑی کی اسپیڈ برائے نام کرنا پڑی۔ ٹریفک برائے نام ہونے کے باوجود بارش کی شدت اور جارحیت کے سبب لوگوں نے اِدھر اُدھر محفوظ مقامات پر پناہ لے لی تھی۔

تھوڑی دیر مسلسل چلنے کے بعد علی کو احساس ہو گیا کہ طوفانی ہوائیں اور دھواں دھار برستی بارش میں سفر جاری رکھنا ناممکن ہے۔ عاجز آ کر انھوں نے بھی گاڑی سڑک سے اتار کر برگد کے ایک گھنے پیڑ کے نیچے کھڑی کر دی۔

انجن بند کرتے ہی ذہن کا اسکرین روشن ہو گیا۔

نگاہوں کے رُوبرو کسی کا معصوم آنکھوں والا سرخ سرخ چہرہ جلتے بجھتے لمحوں کے پار لو دینے لگا۔

تمتماتے رخساروں پر جھکی ہوئی بادلوں کی لٹوں سے دل و نظر لپٹے جا رہے تھے۔ انھوں نے گھبرا کر چاروں طرف نگاہیں گھمائیں۔

وہ اُمنڈتی گھمنڈتی گھٹائیں......

موسلا دھار برستا مینہ......

کڑکتی چمکتی آسمانی بجلی......

بیخ کن کر ڈالنے والے طوفانی ہواؤں کے جھکڑ...... اور...... گھنے برگد کا بھی یادگار پیڑ!

جس کے نیچے اس روز بھی وہ پناہ گزین ہوئے تھے!

مگر آج، ان لمحات میں رانی نہیں، بلکہ رانی کا تصور موجود تھا۔

علی کی اور رانی کی دوسری یادگار اور طویل ملاقات ایسے ہی طوفانی و برفانی موسم

میں ہوئی تھی۔ اور آج تک ان کے دل پر نقش تھی!

علی کا موڈ یک لخت بدل گیا۔

"قصرِ دیار" سے روانگی والی ساری تیزی وطراری وحشت اور اضطراب دھیما پڑتا چلا گیا۔

گھر سے جن طوفانی جذبوں کے تحت چلے تھے، اس کے زور و شور اور روانی میں از خود کمی واقع ہونے لگی۔

بالآخر محسوسات پر اک غم آلودسی افسردگی اور گہری پژمردگی نے اپنا تسلط جما لیا۔ ان لمحوں میں وہ اپنی کیفیات کو پرکھنے سمجھنے سے خود ہی قاصر تھے۔ شائد یہ اُس بے اعتمادی لاچاری اور بے بسی کا شدید ردعمل تھا' جو انہیں رانی کی طرف سے تحفہ ملا تھا۔ اندر سے وہ بے یقینی اور کشمکش کا شکار ہو گئے تھے کہ آیا وہ عشق کی یہ بازی جیت بھی سکیں گے یا.....؟

ایک بہت بڑا اور روح میں شگاف ڈال دینے والا سوالیہ نشان اس موسلا دھار برستی بارش میں اُن کی نگاہوں کے سامنے لہرانے لگا۔

اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ رانی کے روبرو پہنچے تو شوریدہ سرندی کی تندی و تیزی کے بجائے سمندر کی عمیق گہرائیوں کی طرح ساکت و جامد تھے۔ حُسنِ اتفاق سے وہ انہیں ڈرائنگ روم میں اکیلی مل بھی گئی۔

اماں جان سوئی فلو میں مبتلا ہو کر اپنے کمرے میں منہ سر لپیٹے پڑی تھیں، شرمین ان کا جی بہلاتی باتیں کرتی کرتی ان کے پاس پڑ کر سو گئی تھی۔ ماسی مریاں بیٹی کے پاس گئی ہوئی تھیں۔

ان کی گاڑی کو پہچان کر رمضو بابا نے گیٹ کھولا تو وہ گاڑی پورچ میں روک سیدھے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ گویا الہام ہوا ہو کہ گوہر مقصود یہیں دستیاب ہے۔

وہ دریچے کے ٹھنڈے ٹھنڈے یخ شیشوں سے ناک لگائے دیر سے برستی بارش کا لطف اٹھا رہی تھی۔

ناچتی گاتی بوندوں کا جل ترنگ روح میں اتر رہا تھا۔ مگر خود کے اندر.....دور تک اداسیاں منہ بسورائے بیٹھی تھیں..... جانے کا ہے کو!

شرمین کے ریکارڈ پلیئر پر ہلکے سروں میں حدیقہ کوک رہی تھی۔

بوہے باریاں تے نال کنداں ٹپ کے
آواں گی ھواین کے

"ہیلو!"

علی بالکل اس کے کان کے قریب گنگنائے

رانی اچھل پڑی۔

گھوم کر دیکھا تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ ایسے برفانی کہر اور دھواں دھار برستی رُت میں بھی لوگ نکل پڑیں گے!

"کیوں؟ کوئی بھوت نظر آ گیا کیا؟"

لاکھ سنجیدہ ہونے کے باوجود وہ چھیڑنے سے باز نہ آ سکے۔

رانی نے سنبھل کر برستے بادلوں کی طرف اشارہ کیا اور برجستہ جواب دیا:

"انسان تو گھروں سے نکلنے سے رہے ایسے وقت!"

"بالکل ٹھیک..... قطعی درست۔"

علی نے تُرکی بہ تُرکی جواب دیا۔

"بعض ایسے ہی بادلوں بھری اور یخ رُت میں کوئی "بھٹنی" سڑک کنارے رہی ہو تو وہی 'بھوت' اُسے گھر پہنچاتا ہے۔"

لبوں پر چپکے اٹھنے والی مسکراہٹ چھپانے کے لیے تھوڑا سا رخ بدل لیا۔

ان کی چوٹ بخوبی سمجھ میں آ گئی تھی۔ مگر اس وقت بے تکلفی کی فضا قائم رکھنے میں خطرہ تھا۔ جانتی تھی اس بگڑے موسم میں کیوں دوڑے چلے آئے ہیں! اندر ہی اندر ان کے آنے سے کھسار رہی تھی۔ بے چین ہو گئی تھی۔ مگر بظاہر پرسکون نظر آنا چاہ رہی تھی۔ علی چند لمحے اس کی طرف کے جوابی حملے کے منتظر رہے۔ پھر مایوس ہو کر خود بھی شیشے سے تک گئے اور باہر دیکھنے لگے۔

دفعتاً گانا ختم ہو گیا اور ڈرائینگ روم کے گہرے سناٹے میں بوندوں کا جلترنگ سنائی دینے لگا۔ بارش کے پانی کی ٹپاٹپ ہواؤں کی گونج اور بادلوں کی دھم دھم ہو گئی۔

رانی نے گھوم کر ریکارڈ دوبارہ لگا دیا۔

وہی حدیقہ کیانی کی آواز اور اس کے پسندیدہ نغمے کے بول:

"بوہے باریاں تے نال کنداں ٹپ کے
آواں گی ہوا بن کے"

اس دفعہ علی نے کوئی تبصرہ نہ کیا نہ ٹوکا بلکہ بہت توجہ اور قوتِ سماعت صرف کر کے اس گیت کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ انھوں نے اکثر و بیشتر رانی کو بار بار یہی ریکارڈ سنتے اور سر دھنتے دیکھا تھا۔

آج موقع بھی تھا۔ وقت بھی۔

جن جدوں چڑھیا تے لوکی پے تکدے
ڈوگنے پانیاں دے وچ دیوے پے بلدے
کنڈے لگ جاواں کچا گھڑا بن کے
میں آواں گی ہوا بن کے

دلاں دیاں راہاں تے پیر اے نیئیوں لگدے
مقدراں دے لکھے ہوئے مٹ نیئیوں سکدے
مینوں رب نے بنایا تیرے لئی اوئے
جتھے تیرا ناں لکھ کے
بوہے باریاں تے نال کنداں ٹپ کے
آواں گی ہوا بن کے

یہ غور سنتے علی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ انھوں نے آج تک توجہ ہی نہ دی تھی۔ مگر اب جو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہی تو گیت کے مفہوم نے ان کے جسم میں ایک سنسنی دوڑا دی۔ انھوں نے دل میں فیصلہ کیا کہ آج اور ابھی جا کر اماں جان (ماسی اماں) سے اس گیت کا پورا مطلب و معنی ضرور معلوم کریں گے۔

گیت کے آخری بولوں نے ان کے چودہ طبق روشن کر دیے اور وہ گھور گھور کر رانی کا جائزہ لینے لگے۔

گا تیکہ جیسے مدھم مدھم سرگوشیوں میں اپنے خوبصورت اور خوش آئند خیالات کا اظہار یا شاعری کی آڑ میں بیان کر رہی تھی:

"بازی عشق دی جت لاں گی سوہنیا!
میں رب توں دعا منگ کے
بوہے باریاں تے نال کنداں ٹپ کے
آواں گی ہوا بن کے
بوہے باریاں......"

اتفاق سے عین اسی لمحے رانی نے بھی کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھا اور فوراً اس کی چوری پکڑی گئی۔

امید وبیم کی کیفیت سے دوچار علی کے سینے میں خوشگوار دھڑکنیں دھڑ دھڑانے لگیں مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی ذومعنی سی بات کہتے، رانی اپنے مقام سے ہٹ گئی اور گیت بند کر کے خواہ مخواہ کیسٹیں ٹٹولنے لگی۔ کانوں میں رس گھولتی آواز رک گئی تو بارش کی آواز دوبارہ حاوی ہوگئی۔

باہر چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ سیاہ بادلوں کے سینے پر بجلی کڑک کر یہاں سے وہاں تک دودھاری تلوار کی طرح کوند جاتی تو فضا ایک لمحے کے لیے چکاچوند ہو جاتی۔ شیشوں پر بوندوں کی روانی بڑھ گئی۔ ساتھ ہی علی کے سینے پر بھی دوبارہ منوں بوجھ آپڑا۔ روشن چہرے والی امید کی کرن گھٹاٹوپ اندھیروں کی گود میں جا چھپی۔ مایوسیوں، اندیشوں کے کوڑیالے سانپ چاروں طرف پھنکارنے لگے۔ قوت برداشت کے سینے پر بے صبری رہ رہ کر پنجہ مارنے لگی۔ کچھ کر گزرنے پر اکسانے لگی۔ ٹہوکے پہ ٹہوکا مارنے لگی۔ بالآخر انھوں نے ہار مان لی۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

انھوں نے ایک دم ہی جیب سے وہ سفید کاغذ نکال کر اس کے سامنے لہرایا۔ جھک کر سرگوشی میں پوچھا:

"یہ......کیا لکھا ہے؟"

رانی اسی مرحلے سے کترا رہی تھی۔ مگر فیصلہ کن گھڑی بالآخر آپہنچی تھی جانتی تھی اس یخ اور برستے پانیوں میں وہ بلاوجہ تو نہیں آئے! چند ٹھٹھرتے لمحے تیزی سے گزر گئے۔

علی کو اس کی مسلسل خاموشی گراں گزرنے لگی۔ دبے دبے جذباتی لہجے میں خود ہی پہل کر ڈالی:

"میں تمھیں "سرنگوں ڈالی" کے بجائے کوئی بلند و بالا اور تناور درخت نظر

ہوں؟"

"اس میں شک بھی کیا ہے!"

رانی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"بہت خوب!"

علی کا چہرہ تپ گیا۔ جی چاہا اس کم عقل لڑکی کا سر توڑ ڈالیں جو کسی صورت ان کا مدعا سمجھنا چاہ رہی تھی نہ موقع دے رہی تھی

"کوڑھ مغز"

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔

"کیوں! کیا یہ "مفصل جواب" نہیں ہے؟"

رانی نے بظاہر سادگی سے مگر درحقیقت انھیں جلانے کو دریافت کیا۔

وہ سچ مچ جل کر بولے:

"اچھا، میں نے کیا تمھیں امتحانی پرچہ حل کرنے کو دے دیا تھا؟"

جواب دینے کے بجائے وہ ان کے جلے کٹے انداز پر مسکرانے لگی۔

"اب دو نا جواب! چپ کی چادر کیوں اوڑھ لی؟"

انھوں نے سوال کیا۔

"شعر تمھارا لکھا ہوا ہے، وضاحت بھی تمھی کرو گی۔"

"کس چیز کی وضاحت کروں؟"

اس نے سنجیدگی سے نگاہیں اٹھا کر دریافت کیا۔

"یہی جو تم نے لکھا ہے" علی کاغذ دکھا کر بولے۔

کسی سرنگوں سی ڈالی پہ رکیں گے چار تنکے
نہ بلند شاخ ہوگی نہ گرے گا آشیانہ"

اس کا کیا مطلب ہے؟ اگر کل رات والے میرے سوالوں کا یہی جواب ہے تو کتنا بے رحم اور یک طرفہ جواب ہے؟ کیا میری سچائیوں اور حکایت دل کا جواب کچھ زیادہ ہی کڑوا اور سنگدلانہ نہیں ہے؟"

اس دفعہ رانی نے ان کا طویل سوال بغور سنا۔ دل میں فیصلہ کیا، اب یہ بحث ختم ہونی چاہیے۔ بہت ہو چکا۔

جی کڑا کر کے بالآخر کہہ گزری۔

"جو جواب نواب زادوں کی نظر میں کڑوا اور سنگدلانہ ہے، وہ ہم بے مایہ لوگوں کے لیے نہایت مناسب اور محفوظ ترین ہے۔"

علی حیرت زدہ ہو کر اس کی صورت تکنے لگے۔ مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"کیا باور کرانا چاہتی ہو، کھل کر کہو؟"

"سیدھی سادھی سی بات ہے۔ اس میں کوئی پیچ و خم نہیں ہیں۔"

وہ نہایت صاف گوئی اور بے رحمی سے کہتی چلی گئی۔

"ہماری ماسی مریاں کہا کرتی ہیں کہ کمخواب میں گاڑھے کا پیوند کبھی نہیں جچتا اور چوبارے کی اینٹ چوبارے پر ہی لگنی چاہیے۔ خود ان کی زندگی کی کتنی بڑی مثال ہمارے سامنے ہے، جس سے آپ بھی واقف ہیں۔"

بات ادھوری چھوڑ کر اس نے علی کی طرف بغور دیکھا۔ واقعی وہ قدرے بے چین سے دکھائی دیئے۔

وہ انجان بن کر دوبارہ گویا ہوئی۔

"اس دن آپ بھی تو بیٹھے تھے جب انھوں نے اپنی داستان حیات سنا شروع کر دی تھی۔ کیسی عبرت انگیز کہانی تھی ان کی! یقین کیجیے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کی زبانی سننے سے پہلے میں کبھی یقین بھی نہیں کر سکتی

کہ وہ کسی نواب صاحب کی بیوی رہ چکی ہیں۔ اس چوک سے ان بے چاری کو کیا ملا؟ سوائے دنیا میں ذلیل و خوار ہونے کے اور در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے! ساری زندگی تباہ و برباد ہو گئی نا ان کی؟ ان نواب صاحب کا کیا بگڑا؟ وہ تو ان بے چاری کو ایک عدد بیٹی کا تحفہ دے کر کہیں روپوش ہو گئے، ادھوری یہ ماں بیٹی رہ گئیں۔

اب ذرا تجزیہ کیجیے۔

یہ ایک گورکن کی بیٹی تھیں، اگر کسی اپنے ہی جیسے گورکن یا غریب گھرانے میں بیاہ دی جاتیں تو کم از کم ایسا تکلیف دہ انجام تو نہ ہوتا! میں تو سمجھتی ہوں دنیا میں بے جوڑ شادی سے زیادہ ہیبت ناک اور درد بھرا رشتہ کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ آپ خود انصاف کیجیے۔ ان نواب صاحب کے بجائے اگر ہماری ماسی مریاں کی شادی اگر اسی گورکن زادے سے ہو جاتی، جسے ماسی مریاں اس وقت اپنی نادانی اور بے وقوفی میں کوئی نمبر دینے کو تیار نہ تھیں، تو زیادہ مناسب نہ ہوتا! کیونکہ عین ممکن ہے وہ آج تک بھی زندہ ہوتا اور ان کا ہم جوڑ ہونے کی وجہ سے یقیناً بیوی بچوں کا سائبان بنا ہوتا۔ جبکہ اب یہ حال ہے کہ بے چاری کا کوئی پرسان حال ہی نہیں ہے۔ سارا دن اماں جان سے باتیں کر کر وقت گزارتی ہیں یا پھر کبھی کبھار اپنی بیٹی اور ان کے بچوں سے ملنے کے لیے چلی جاتی تھیں۔ اب کچھ عرصے سے بیٹی نے رہائش کہیں قریب ہی بدل لی ہے اس لیے ذرا جلدی جلدی جانے لگی ہیں۔ آج کل پھر وہیں گئی ہیں بے چاری کا جی بہل جاتا ہے اب تو بہت خوش رہنے لگی ہیں۔"

باہر بارش برسے جا رہی تھی۔

بادل رہ رہ کے گرج رہے تھے۔ ہوائیں شور مچا رہی تھیں۔ اندر ڈرائنگ روم کی

فضا بخ بستہ اور دم بخود تھی۔ رانی کی کھنکتی آواز اور ٹھہرا ٹھہرا لہجہ علی کے حواس پر چھم چھم دھار کنکریوں کی طرح برس رہا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے علی بولنا ہی بھول گئے ہوں۔

رانی نے کبھی ان سے اس طرح کھل کر باتیں نہیں کی تھیں۔ زندگی کے متعلق اپنا نقطہ نظر وہ بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھا رہی تھی۔ علی کی افسردہ نگاہیں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ دلآویز چہرہ جو اس وقت بہت سنجیدہ اور حسین لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر صاف احساس ہو رہا تھا کہ وہ جتنی باشعور اور سمجھدار لڑکی ہے، اس سے کہیں زیادہ گہری اور اپنے حالات سے آگاہ بھی ہے۔

وہ ٹکر ٹکر اس کی صورت تکے جا رہے تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ان کی زبان سے بے اختیار ایک شعر پھسل پڑا۔

”تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا!“

رانی نے چونک کر شعر سنا۔ مفہوم کو سمجھا اور ایک جی جلا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ ترکی بہ ترکی چند اشعار جڑ دیئے۔

گھر ڈوب گیا اور انھیں آ واز نہیں دی
حالانکہ میرے سلسلے اُس پار بہت تھے
چھت پڑنے کا وقت آیا تو کوئی نہیں آیا
دیوار گرانے کو رضا کار بہت تھے
گھر تیرا دکھائی تو دیا دور سے لیکن
رستے تیری بستی کے پُر اسرار بہت تھے

علی، کچھ غصے، کچھ رنج کے شدید احساسات کے ساتھ اٹھ کر کھڑے ہو

گئے۔ چہرہ غیر معمولی طور سے سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھیں گہری ہو گئیں۔ یوں لگا جیسے کچھ کہتے کہتے رک گئے ہوں۔ یا پھر کہتے نہ بن پایا ہو۔ اچانک ہی جھٹکے سے گھومے اور طوفانی انداز میں باہر نکلے چلے گئے...... رانی ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔



انھیں اپنے بے پناہ غم و غصے اور رنج کا اظہار بھی نہ کرنا آیا تھا۔

دل ہی دل میں سارے تاثرات سمیٹے پورچ میں آئے اور رمضو بابا کے روکتے روکتے بھی گاڑی باہر نکال لے گئے۔

بہت دیر تک ان کو احساس ہی نہ ہو پایا کہ باہر باد و باراں کا شدید ترین طوفان آیا ہوا ہے۔ وہ گاڑی سمیت جانا آگے چاہ رہے تھے طوفان کا ریلا ان کو اتنی ہی شدت کے ساتھ پیچھے دھکیل دینے کے درپے تھا۔ مگر دونوں ہی شکست قبول کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ان کے چاروں اطراف سائیں سائیں کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دے رہی تھی۔ سرپھری ہواؤں کی تیزی اور طراری میں بغاوت کے آثار مکمل ہو چکے تھا اور یہ ہوائیں زور و شور سے چلتے ہوئے جھکڑوں میں تبدیل ہو کر بلند و بالا درختوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے خوفناک آوازیں پیدا کر رہے تھے۔

چھوٹے چھوٹے کم مصروف روڈ استعمال کرتے ہوئے شاہراہ عام پر آئے تو دور تک سوائے برستے بادلوں کے کوئی ذی روح نظر نہ آتا تھا مگر اس وقت وہ اپنے ہوش میں کب تھے! گیلی سڑک بے حد پھسلنی اور خطرناک ہو گئی تھی۔ عقل ٹھکانے ہوتی

For more urdu novels please visit:
www.pakistanipoint.com

تو وہ ضرور کسی محفوظ مقام پر پناہ گزین ہونے کی کوشش کرتے۔ لیکن اگر اس وقت حواس بحال ہوتے تو وہ جانتے بوجھتے گھر کے محفوظ در و دیوار کو خیر باد کہہ کر باہر نکلتے ہی کیوں؟

نظر انداز کیے جانے کا دکھ ان کے رگ و پے میں زہر کی طرح اتر گیا تھا۔ رہ رہ کر رانی کا بیگانہ لہجہ اور غیریت سے بھرپور رویہ تیز سے کی انّی کی مانند دل و دماغ میں چبھ رہا تھا۔ گزر رہا تھا۔ ایک ناقابل بیان کھٹک پیدا کر رہا تھا۔

اس کی باتیں اب تک سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ اور ٹکرا ٹکرا کر ایک پُرہول مایوسی اور بے قراری کا سبب بن رہی تھیں۔ وقت اور حالات ایک دردناک عذاب بن کر مسلط ہو گئے تھے۔ جن سے فرار حاصل کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن لگ رہا تھا۔

کئی میل کا فاصلہ اسی صورت اور گھمبیر کیفیت میں طے کرنے کے بعد صورت حال کچھ کچھ تبدیل ہونے لگی۔

انہوں نے محسوس کیا جیسے وہ چیونٹی کی رفتار سے آگے بڑھ رہے ہوں۔ اس طرح سے تو سفر کٹنے کے آثار نہ تھے۔ انھوں نے اپنے آس پاس نگاہیں دوڑانا چاہیں مگر سوائے شفاف شور مچاتے پانی کی چادر کے اور کچھ بھی دکھائی نہ دے سکا۔

"اُف خدایا!"

وہ ایک ہاتھ سے پیشانی دباتے ہوئے بڑبڑائے۔

"آج کس مصیبت میں جان پھنس گئی! شاید مجھے کہیں رک کر بارش تھمنے کا انتظار کرنا چاہیے! ہاں یہی مناسب ہے ورنہ تو...... کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ موسم کے بگڑے بگڑے تیور جانے کیا سمجھانا چاہ رہے ہیں"

انھوں نے سوچتے ہی فیصلہ کیا اور فیصلے کے فوراً بعد عمل بھی کر ڈالا۔

بے حد آہستگی سے گاڑی کا رخ تبدیل کیا اور قریب ترین درخت کے نیچے کھڑی

کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک دم ہی قدرے امن اور سکون کا احساس ہوا۔

اطمینان کا ایک گہرا سانس لیتے ہوئے انھوں نے انجن بند کر دیا۔ لمحہ بھر کے لیے سناٹے کا احساس ہوا لیکن جلد ہی طوفان کی زناٹے دار آوازوں میں کہیں جا کھویا۔

آج سکون ان کے مقدر سے ناپید ہو چکا تھا۔ کیونکہ جلد ہی ان کی کرشمہ ساز چھٹی حِس بیدار ہو گئی اور وہ ایک دفعہ پھر شدید اضطراب کا شکار ہو گئے اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔

"اُف!!"

وہ ایک دکھی سانس بھر کر رہ گئے۔ سینے میں درد و گداز کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ابلنے لگا۔

آج مقدر پھر انھیں اسی برگد کے بلند و بالا اور یادگار درخت کے نیچے کھینچ لایا تھا۔ جس کے قریب سے بھی گزرتے ہوئے ہمیشہ رانی کا خیال حاوی ہو جاتا رہا تھا۔ اتفاق سے اس وقت کسی دوسری سواری نے یہاں پناہ نہیں لی تھی۔ علی اور ان کی گاڑی کے سوا دوسرا کوئی نہ تھا۔ لہٰذا رانی اور رانی سے وابستہ ہر گمان، ہر خیال اور ہر بات کا رنگ گہرے سے گہرا ہوتا گیا۔ وہ زمان و مکان کی حدود سے نکل کر کہیں سے کہیں جا کھوئے۔ وہ کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ کہاں سے آ رہے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ ایسا ہر سوال تشنہ ہی رہ گیا۔ کچھ دیر قبل کی واردات اور رانی کا رویہ اور باتیں دل و دماغ اس حد تک تازہ اور اتنا کٹ بھری ہوئی تھیں کہ وہ اپنے گرد و پیش سے قطعی غافل ہو گئے۔

اسی جگہ اور اسی برگد کے پرانے پیڑ کے نیچے طوفانی موسم کی اس دل پر نقش ہو جانے والی واردات سے لے کر آج تک کے تمام واقعات بہت تسلسل وار روح کے سر بند کواڑ کھول کر یکے بعد دیگرے وارد ہو رہے تھے۔

سرخ سرخ آنچ دیتے رخساروں پر جھکی ہوئی سیاہ بالوں کی لٹیں!

وہ ایک دبا دبا سا سانس لے کر رہ گئے۔

رانی کے پڑھے ہوئے اشعار تو انھیں یاد نہیں تھے، مگر اتنا ضرور یاد رہ گیا تھا کہ وہ کسی خودی، ناقابلِ بیان کیفیت سے بلبلا کر اس کے گھر سے چلے آئے تھے۔ دماغ میں فوراً یہی جھماکا ہوا تھا کہ وہ لڑکی جس کی خاطر انھوں نے اپنی پھپھو جانی، پھوپھا صاحب اور بہنوں سے کیسی لمبی لمبی بحثیں کر کے انھیں رام کیا تھا۔ اپنے موقف پر مردانہ وار ڈٹ کر مسلسل اس کی حمایت کی تھی، اور اس کے ہر نا روا سلوک کو ہنس ہنس کر ٹال ٹال دیا تھا...... وہ کسی صورت بھی ان کا اعتبار کر لینے کو تیار نہ تھی!

ان کی طرف سے کس قدر بے بھروسہ تھی وہ!

اچانک انھیں اس کے پڑھے ہوئے اشعار کا آخری مصرعہ یاد آ ہی گیا۔

"رستے تیرے گھر کے بہت پُر اسرار تھے"

پُر اسرار...... یعنی اسرار سے بھرے ہوئے!!"

علی نے بہت حیرانگی کے عالم میں اپنے آپ سے سوال کیا۔

ان کی اس درجہ برفروختگی کا سبب بھی یہی الفاظ تھا۔ بے پناہ رنج اور دلی صدمے سے ان کی حالت ایک دفعہ پھر بگڑنے لگی۔

عین اسی لمحے بادل بہت خوفناک انداز میں گڑگڑائے۔

بجلی اس زور سے کڑکی کہ دل و دماغ تھرتھرا اٹھے۔ پل بھر کے لیے سماعت جاتی رہی۔ ایک فلک شگاف کڑک سے بڑی روح دہل گیا۔

زبردست چکا چوند سے دور دور تک راستے اور نقشے روشن ہو گئے۔ علی کے سے جواں مرد کا دل سینے میں کانپ گیا۔ انھوں نے بے اختیار کلمہ پڑھتے ہوئے ہاتھ

کانوں پر رکھ لیے اور سر سٹیرنگ پر......

تبھی وہ ٹھیک سے دیکھ بھی نہ سکے۔

بلند و بالا برگد کا ایک تناور اور بھاری بھر کم ٹہنا بہت بلندی سے ٹوٹا اور ایک قیامت خیز رفتار اور آواز کے ساتھ ان کی گاڑی پر آن گرا۔



اگلے دن چھٹی کا دن تھا۔

ایسا دن کہ اگر رمضان المبارک نہ ہوتے تو بہت مصروف دن ہوتا۔ لیکن روزہ ہونے کی وجہ سے کم از کم صبح سے دوپہر تک کوئی کام اور مصروفیت نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ سحری کے بعد فجر ادا کرو، تلاوت کلام سے فارغ ہو کر لمبی تان کر سو رہو۔

ایسے میں جب کہ ماسی مریاں بھی غیر حاضر ہوئیں تو لڑکیوں سے پہلے اماں ہی اٹھتیں کیونکہ جھاڑو پونچھا کرنے والی آجاتی تو ایک دو کام خریدنکل آتے۔ رانی اور شرمین کے اٹھنے سے پہلے اماں شام کے لیے رمضو بابا سے سودا سلف بھی منگوا لیتیں۔

کل کے طوفانِ بادوباراں نے اک تہلکہ مچا ڈالا تھا۔

باہر سے رمضو بابا آئے تو یہی کہانیاں لیے ہوئے۔

کام والی پہنچی تو ایسی ہی خبروں کے ساتھ۔

شہر بھر کا مواصلاتی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ بجلی اور ٹیلی فون کے کھمبے زمین بوس ہو گئے تھے۔ سینکڑوں درخت جڑوں سے اکھڑ گئے تھے۔ نشیبی علاقے گھٹنوں گھٹنوں پانیوں میں ڈوب گئے تھے۔ کچی آبادیوں میں جانی اور مالی نقصان زیادہ ہوا تھا۔ پانی کے ذخائر کی ارد گرد والی بستیاں زیرِ آب تھیں۔ معلوم نہیں کتنے گھر گر چکے تھے۔ کتنے لوگ مال مویشیوں سمیت بہہ گئے تھے۔ کتنے بے گھر ہو گئے تھے اور کتنے مر چکے تھے۔ اک کہرام کا سماں تھا، جو چہار عالم میں پھیل گیا۔

شہر کا بیشتر علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

آسمان آج بھی بادلوں سے ڈھکا ڈھکا تھا مگر کل والی کیفیت تھی اور نہ کل کی تباہی و بربادی کے آثار۔

بہت بڑے بڑے المناک واقعات کے بعد زمین و آسمان سکون پذیر ہو چکا تھا۔ بس اب نقصان گزیدہ اپنے زخموں کی ٹیسیں سہہ رہے تھے۔

اسپتال زخمیوں اور مرنے والوں سے بھر گئے تھے۔

ہاکر اخبار ڈال گیا تو اماں جان سرخیاں پڑھ کر دہل گئیں۔ مارے ہول کے انھوں نے چیخ چلا کر لڑکیوں کو جگا ڈالا۔

صورتِ حال واضح ہوئی تو رانی کو سب سے پہلا خیال علی کا ہی آیا۔ یہاں سے

جس طیش کے عالم میں روانہ ہوئے تھے، رانی کو اس کا بہر حال پورا ادراک بھی تھا...... احساس بھی...... وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

غور سے دیکھا۔ اخبارات واقعی کل کی قدرتی آفات کی خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ اداریے چیخ اٹھے تھے۔ دردناک اور رونگٹے کھڑے کر ڈالنے والی تصاویر نے دل ہلا ڈالا۔

شہر کے مضافات میں کئی مقامات پر آسمانی بجلی گرنے کے واقعات ہوئے تھے۔ بلند و بالا درخت جڑوں سے اکھڑے پڑے تھے۔ پختہ سڑکوں پر بھی پانی ہی پانی دکھائی دے رہا تھا۔

وہ چھلانگ مار کے بستر سے نکل بھاگی۔

ٹیلی فون کی لائنیں معلوم نہیں رات کے کس پہر بے جان ہو چکی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی جنریٹر اسٹارٹ کرایا۔ کانپتے ہاتھوں سے ٹی۔ وی آن کر کے بیٹھ گئی۔ اور دل پسلیاں توڑ کر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔

ٹی۔ وی خبر نامے میں ہر طرف سسکتے ہوئے مناظر تھے۔ تڑپتے ہوئے لاشے تھے۔ تباہی اور بربادی کی داستانیں تھیں۔

"الٰہی سب کی خیر ہو"

اماں جان نے ایک ٹھنڈا سانس بھر کر سب کے لیے دعا کی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی عادت کے مطابق اس کی زبان سے پھسل پڑا۔

"آپ نے دیکھا نہیں اماں کہ ستم کچی آبادیوں پر ٹوٹے ہیں۔" اونچی وادیاں "سب خیریت سے ہیں۔ آپ پریشان مت ہوں۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟"

اماں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

اس نے لاپرواہی اور بے نیازی برتنی چاہی۔

"میرا مطلب ہے...... ابو جان بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ بڑے لوگوں
قریب سے مصیبتیں بھی پہلو کترا کر گزر جاتی ہیں۔"

"لاحول ولاقوۃ!"

اماں جان ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

"ہم پوچھتے ہیں تمہاری کھوپڑی کا خناس کیا کر کے دم لے گا؟"

انھوں نے رانی کو بری طرح لتاڑ ڈالا۔

"خدا کے خوف سے ڈرو بیٹی۔ ہر وقت کے وہم و گمان اور برے بول اچھے
ہوتے۔ تم ایک باشعور لڑکی ہو۔ اپنی سوچوں اور خیالات کو بدلو۔ سب کو ایک ہی نگا
سے مت ہانکا کرو۔ نہ ایک جیسی عینک سے دیکھو۔"

رانی شرمندہ ہو گئی۔

شرمین بڑبڑاتی ہوئی اپنی گڑیوں کے کپڑے الٹ پلٹ رہی تھی۔

"ایک تو یہ ماسی مریاں ہر روز ہی مہمان بن بن کر جانے لگیں۔ معلوم نہیں
اتنا اپنی بیٹی کے پاس کیوں جانے لگی ہیں۔ میری ساری گڑیوں کے سارے
پھٹ گئے ہیں مگر انہیں فرصت نہیں ہے......"

رانی اس کی بڑبڑاہٹ سن کر اٹھ گئی۔ مگر دخل نہ دیا۔ طبیعت بہت اچاٹ ہو رہی
تھی۔ کسی کام میں جی نہ لگ رہا تھا۔

سارا دن وہ جلے پیر کی بلی کی طرح بے چین گھومتی رہی۔

آج خلاف معلوم اس نے روزہ افطار کے لیے بھی کوئی اہتمام نہ کیا۔ ظہر کی نماز
ے لیے جا نماز پر کھڑی ہوئی تو جانے کیوں دل بھر آیا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے،
ن پھیلایا تو زندگی میں شاید پہلی بار وہ جی کھول کے روئی۔

"یا اللہ! میں کیا چاہتی ہوں؟ شاید مجھے نہیں معلوم۔

میری مدد فرما۔ میرا رہنما بن جا میرے خدا......"

اب تک اس کی دعا میں ربط تھا نہ سوچوں میں!

جب وہ جا نماز لپیٹ رہی تھی تو اس نے غور کیا۔

شرمین نے اس کا پسندیدہ نغمہ لگا رکھا تھا۔ حدیقہ آخری بول گا رہی تھی۔

"بازی...... عشق دی جت لوں گی سوہنیا،
میں رب توں دعا منگ کے،
لوے باریاں......
لوے باریاں تے نال کنداں ٹپ کے،
میں آواں کی ہوا بن کے"

وہ سر جھٹک کر کچن میں جا گھسی۔ مگر آج کی تاریخ میں اقرار نا پید
۔ ایسی نادان تو نہ تھی کہ اپنا موقف نہ سمجھ پاتی! اس نے کتنوں اپنے اور علی
متعلق ہر زاویے سے موازنہ اور تجزیہ کیا تھا، یہ ضرور ہے کہ علی کی شخصیت
ان کے پورے کنبے میں اسے کوئی جھول اور کھوٹ باوجود تلاش بسیار کے
نہ آیا۔ اپنے انکار اور کشمکش کا راز اس کے سوا دکھائی نہ دیتا کہ...... اس

کے اندر کہیں ایک خوف اضطراب، ڈر اور وہم ہمیشہ کے لیے پنجے گاڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

وہ دل ہی میں خود کو ڈرانے کی کوشش میں مصروف رہتی۔

"خبردار رانی!

ماسی مریاں سے بھی بدتر حالات کا شکار ہو جاؤ گی!

بھول کر بھی اپنا مستقبل نواب فیملی سے وابستہ نہ کر بیٹھنا۔ شاد بیگم کی طرح ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دی جاؤ گی۔ اپنا مطلب نکل جانے پر بڑے لوگ طوطے کی طرح نگاہیں پھیرنے میں دیر نہیں لگاتے۔

خود ابو جان نے بھی تو اماں کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا! اور پھر...... اسی نواب نے ماسی مریاں کو کیا دیا؟

لاکھ نواب صاحب کا انتقال ہو گیا مگر علی نے ان بے چاری کو کونسی ریلیف دی! پوری کہانی سن کر بھی خاموشی اختیار کر لی۔

کبھی میرے سامنے تک یہ تذکرہ نہ لائے...... اف توبہ"

اتوار کا سارا دن اسی کشمکش اور اضطراب میں کٹ گیا۔

اگلے روز وہ حسب معمول کالج پہنچی تب گویا بھونچال سا آ گیا۔

پورے کالج کی طالبات ٹولیوں میں بٹ بٹ کر "قصرِ دیدار" کا رخ کیے ہوئے تھیں۔ سب کے چہروں کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ ہر طرف ہلکی ہلکی سرگوشیاں اور بھنبھناہٹ تھی۔

کیا اساتذہ، کیا طالبات اور کیا اردلی، چپراسی سب دعاءِ خیر میں مصروف

تھے۔ ایسا منظر کسی نے آج تک یہاں کے ماحول میں نہ دیکھا نہ سنا تھا۔ کالج سے "قصرِ دیدار" تک ایک سوگوار فضاء کا تسلط تھا۔

رانی کا دم فنا ہو گیا۔

کل سے اب تک کے تمام خدشے پورے ہو گئے تھے۔ سب سے غیر حالت میں وہ بھی "قصرِ دیدار" پہنچی تو اسے ہاتھوں ہاتھ کسی ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں اس وقت کالج کی کوئی ساتھی موجود نہ تھی مگر اپنی لرزاں لرزاں کیفیت میں وہ بجھ نہ پائی۔

سب سے پہلی نظر علی پر جم کر رہ گئی۔ بہت ساری پٹیوں میں جکڑے براہ راست اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ رانی کی آنکھیں پرنالہ بن گئیں۔ تبھی کوئی ہمک کر اس سے چمٹ گیا۔ شہزادی تمبا کو کا تیز بھبکا دماغ سے ٹکرایا۔

"اللہ خوش رکھے...... میری بچی آ گئی"

رانی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ ماسی مریاں بہترین پوشاک زیب تن کیے اس سے لپٹی ہوئی تھیں۔ ان کی کلائیوں میں کھنا کھن بجتے ہوئے کنگن رانی کے پیچھے تو رانی کو ہوش آیا۔

اس نے بوکھلا کر علی کی طرف دیکھا۔ جہازی سائز بیڈ پر لیٹے سفید پٹی کی اوٹ سے بھی ان کے بھرے بھرے ہونٹ شرارتی انداز میں مسکرا رہے تھے۔ ان کے عقب میں فیروز جہاں، شاہ جہاں، شاد جہاں اور اس کے بچے کھڑے ہنس رہے تھے تبھی علی کے تکیے پر کھاٹیپ بجنے لگا۔

ولاں دیاں راہاں تے پھیرے نیوں لگدے

مقدراں دے لکھے ہوئے مٹ نئیں سکدے

مینوں رب نے بنایا تیرے لئی اوئے،

مُتھے تیرا ناں لکھ کے......

بوہے باریاں......

آواں گی ہوا بن کے......

اختتـــــــــــام